منظر و پس منظر

اختر اورینوی

مکتبہ اُردو لاہور

طبع ثانی
قیمت ۳/-

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام چوہدری نذیر احمد پرنٹر پبلشرز چھپکر مکتبہ اُردو سے شائع ہوئی

فہرس

پیش لفظ

قصہ کہانی بہت پرانی چیز ہے۔ اسکی ابتدا نسل انسانی کی ابتدائی ترقیوں کے دھندلکے میں گم ہے۔ انسان، وہ تہذیب یافتہ ہو یا وحشی، بچہ ہو یا بوڑھا، کہانیوں کا فطری طور پہ شائق نظر آتا ہے جس طرح اس کی آنکھیں کسی نئے، غیر معمولی، دلچسپ تماشے کی مشتاق رہتی ہیں، بجنسہٖ اسی طرح اس کے کان نئے نئے قصوں، انوکھی کہانیوں، رنگین داستانوں کے لئے بیقرار رہتے ہیں۔ ان قصوں، کہانیوں داستانوں کے فیض سے اس کی سادہ، معمولی، بیرنگ زندگی رنگین وخوشگوار بن جاتی ہے۔ بہر کیف کہانیوں کی دلچسپی، قدامت اور عالمگیری مسلم ہے۔ اس لئے امید ہو سکتی ہے کہ کہانیوں نے فنی حیثیت سے ادب کی دوسری صنفوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اور بہت پہلے ترقی کی ہوگی۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ جسے فن افسانہ کہتے ہیں۔ اس کی "ٹکنیک" کی ترقی کو کچھ زیادہ دن نہیں

ہوئے ہیں۔ لیکن اس مدت میں مغربی مصنفین نے اس فن پر کامل عبور حاصل کر لیا ہے۔ انہوں نے افسانہ کی فنی خصوصیتوں، اس کی دشواریوں، اس کی حدود اور گنجائشوں کو سمجھا اور برتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اردو میں بھی فن افسانہ نے بہت ترقی کی ہے۔

فن افسانہ مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ عموماً اسے ناول سے زیادہ دشوار خیال کیا جاتا ہے محض اس لئے کہ افسانہ کا پیمانہ مختصر ہے اور ناول کا پیمانہ وسیع ہے۔ افسانہ کے مختصر پیمانہ میں تکمیل کا حصول مشکل ضرور ہے لیکن ناول کے وسیع، پیچیدہ، سیر حاصل سانچے میں کامیابی مشکل تر ہے۔ ناول اور افسانہ میں تقریباً وہی فرق ہے جو نظم و شعر منفرد میں ہے۔ شعر میں ایک خیال، ایک جذبہ کا کامیاب و مکمل بیان ہوتا ہے۔ نظم کی ابتدا بھی کسی ایک زبردست جذبہ کے ماتحت ہوتی ہے لیکن کسی نظم میں صرف ایک جذبہ یا خیال موجود نہیں ہوتا۔ نہایت سادہ اور مختصر نظم میں بھی مختلف جذبات و خیالات، متنوع اور پیچیدہ نقوش ہوتے ہیں۔ شعر کے مختصر پیمانہ میں متنوع اور متعدد خیالات و جذبات نہیں سما سکتے۔ شعر میں اصل شکل اس کا اختصار ہے۔ اس اختصار کے ساتھ کسی خیال کا مکمل، صاف، کامیاب، پُر زور و پر تاثیر بیان آسان نہیں۔ نظم کا سانچہ زیادہ وسیع ہے، اس میں گنجائشیں زیادہ ہیں، اس میں بظاہر اختصار کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے اسے آسان خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ کامیاب شعر کہنے والے بہت ہیں لیکن کامیاب نظمیں ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں افسانوں کا سیلاب ہے۔ لیکن ایک بھی کامیاب ناول لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ اوسط درجہ کے شعر ہر شخص موزوں کر سکتا ہے۔ ہر وہ شخص جسے اوزان و بحور سے واقفیت ہے (یا جس نے موزوں طبیعت پائی ہے) جسے زبان

پر قدرت حاصل ہے اور جسے غزلوں کے محدود مضامین سے آگاہی ہے۔ اوسط درجہ کے شعراء اچھے شعر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہ فرق آسمان زمین کی دوری کی طرح صاف نظر نہیں آتا۔ اچھے شعر کے لئے اصلیت ضروری ہے۔ لیکن اصلیت کی تمیز آسان نہیں۔ بہرکیف اوسط درجہ کی نظم کی وہ فراوانی نہیں۔ اس کی مختلف وجہیں ہیں۔ یہاں ان کے بیان کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ یہ کہنا کافی ہے کہ وہ شخص جسے اوزان و بحور سے واقفیت ہے اور جسے زبان پر قدرت حاصل ہے۔ نظمیں نہیں لکھ سکتا اور اگر اس نے نظمیں لکھیں بھی تو ان کی خامیوں کو سطحی نظر بھی بآسانی دیکھ سکتی ہے۔ بہرکیف اوسط درجہ کے اشعار اور اوسط درجہ کے افسانوں کی ایک حالت ہے جس نے افسانوں کی "ٹکنیک" سے کچھ سطحی واقفیت بہم پہنچا لی ہے اور جسے خیالات و واقعات کے اظہار پر قدرت ہے۔ وہ افسانے مرتب کر سکتا ہے۔ لیکن صنفِ ناول میں اوسط درجہ کی کامیابی بھی مشکل ہے

میں نے ابھی افسانوں کی "ٹکنیک" کا ذکر کیا ہے۔ افسانوں میں کسی ایک واقعہ، کیرکٹر، فضا کا بیان ہوتا ہے۔ پیمانہ مختصر ہے۔ اس لئے اس میں یہ گنجائش نہیں کہ مختلف و متنوع واقعات و حالات، متعدد افراد، پیچیدہ فضائیں پیش ہو سکیں۔ ان چیزوں کی کامیاب عکاسی ناول میں البتہ ممکن ہے۔ ناول میں صرف ایک واقعہ، ایک یا چند افراد، ایک محدود فضا کا بیان نہیں ہوتا۔ جسے ناول کا "پلاٹ" کہتے ہیں وہ مرکب ہوتا ہے مختلف واقعات، اکثر مختلف قصوں سے۔ اس میں متعدد افراد سانس لیتے ہیں اور اپنی زندگی کو پا لیتے ہیں اور یہ واقعات اور افراد مل کر ایک نقش کامل تیار کرتے ہیں۔ اس کثرت میں وحدت کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ یہ وحدت افسانوں کیلئے ناگزیر ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ناول میں یہ وحدت نہ ہو اور اس لحاظ سے وہ ناول ناقص ہوگا۔ لیکن اس

نقص کی وجہ سے ناول کو یک قلم ناقابل اعتنا نہیں خیال کیا جائے گا لیکن کسی افسانہ میں اگر یہی نقص ہو تو پھر وہ کسی کام کا نہیں۔ بہرکیف، یہ وحدت افسانوں کے لیئے صرف لازمی ہی نہیں بلکہ ان میں یہ وحدت ہی سب کچھ ہے یعنی ان میں کثرت کی گویا مطلق جلوہ گری نہیں ہوتی۔ اس لئے افسانہ نگار نہایت ہوشمند ہوتا ہے اور وہ کسی خاص موضوع کو (وہ کچھ بھی ہو) منتخب کر کے اپنی ساری قوت ایجاد اپنے فن کے سارے ساز و سامان اس موضوع پر صرف کرتا ہے۔ اس کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ اس ایک شے کو نہایت پُر زور اور با اثر طریقے سے پیش کرے اور افسانہ پڑھکر قاری کے دماغ میں یہ موضوع اپنی مکمل صورت میں صفائی و استحکام کے ساتھ نقش ہو جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر افسانہ ناکامیاب تصور کیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ افسانوں میں دلچسپی کا مرکز ایک امر طرف ایک ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مرکز بھی موجود ہو جو اپنی طرف قاری کی توجہ کو کھینچ لے تو پھر افسانہ فنی حیثیت سے ناقص رہیگا۔ اسی وجہ سے افسانہ نگار اپنی ساری قوت وحدت اثر کی تخلیق میں صرف کرتا ہے اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ مختلف ذریعوں کا استعمال کرتا ہے۔ سب سے اہم چیز اختصار ہے۔ وہ ہر چیز کو مختصر پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں کفایت شعاری اختیار کرتا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں اپنے خیالات مختلف واقعات کو پیش کر دیتا ہے فضول، غیر متعلق، طولانی بیانات سے وہ پرہیز کرتا ہے۔ کسی غیر متعلق خیال یا واقعہ کو وہ اپنے افسانہ کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ وہ ایک لفظ سے سینکڑوں لفظوں کا مصرف لیتا ہے اور جو کچھ اسے کہنا ہوتا ہے اسے بے کم و کاست آئینۂ الفاظ میں جلوہ گر کرتا ہے الغرض

صفائی، اختصار، کفایت شعاری، بے کم و کاست اظہارِ خیال یہ چیزیں ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہتی ہیں جن باتوں کا یہاں ذکر ہوا۔ اگر ان سے واقفیت ہے اور زبان پر قدرت حاصل ہے اور معمولی درجہ کی قوتِ ایجاد یا تخیل بھی موجود ہے تو پھر ہر ایسا شخص اوسط درجے کے افسانے کامیابی کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔

حقیقی کامیابی کے لئے محض "ٹکنیک" سے واقفیت اور اس میں مہارت کافی نہیں، افسانہ اور ناول اپنے اختلافات کے باوجود بھی ایک اہم چیز میں متشابہ ہیں۔ افسانہ ہو یا ناول دونوں میں زندگی کی عکاسی ہوتی ہے جس افسانہ میں زندگی کے کسی پہلو کی عکاسی نہ ہو وہ افسانہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی افسانہ میں جن اور پری اور ان کے کارناموں کا ذکر ہو یا کسی فوق الفطرت واقعہ کی عکاسی، تو اسے افسانہ نہیں کہہ سکتے۔ افسانہ، ادب کی دوسری صنفوں کی طرح، زندگی کا آئینہ ہے۔ اس لئے زندگی سے واقفیت افسانہ نگار کیلئے ضروری ہے اور یہ واقفیت وہ معمولی اور سطحی واقفیت نہیں جو ہر شخص کو کم و بیش میسر ہے افسانہ نگار کی آنکھیں تیز اور باریک بیں ہوتی ہیں۔ وہ ایسی ایسی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے جس سے معمولی اور سطحی نظر کبھی آگاہ نہیں ہوتی یا وہ معمولی اور سطحی چیزوں کو ایسے لمحہ ایسے رنگ میں یا ایسے زاویہ سے دیکھتا ہے جس لمحہ اور رنگ میں، جس زاویہ سے وہ بالکل نئی، انوکھی اور یکتا معلوم ہوتی ہیں۔ اگر افسانہ نگار محض معمولی اور سطحی چیزوں کا بیان کرے تو اپنی "ٹکنیک" کی خوبی کے باوجود بھی اس کے افسانے قابل قدر خیال نہیں کئے جا سکتے اور اس کے افسانے اپنے ظاہری حسن کے باوجود بھی مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھ سکتے۔ اگر وہ دلچسپی اور جاذبیت رکھتی

قیمتی نہیں ہوتا۔ افسانہ میں یہ واقعہ، کیرکٹر، فضا ایک حیرت انگیز معنی خیزی اختیار کر لیتے ہیں یہ معنی خیزی اسے اہم اور وقیع بنا دیتی ہے۔ اس معنی خیزی کی وجہ سے معمولی وسادہ واقعہ میں ایک روح، غیر فانی روح دوڑنے لگتی ہے۔ یعنی افسانہ نگار کسی بظاہر معمولی واقعہ کی معنی خیزی سے واقف ہو کر اسے آشکار کرتا ہے یا کسی معمولی واقعہ کو معنی خیز بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ، کسی افسانہ نگار کی شخصیت بھی اہم حصّہ لیتی ہے۔ بظاہر وُہ اپنی شخصیت کو اپنے افسانوں سے علیحدہ رکھتا ہے اور اپنی شخصیت کی خصوصیات کو افسانوں میں جلوہ گر نہیں ہونے دیتا لیکن پس پردہ اُس کی شخصیت ہمیشہ موجود رہتی ہے اور اگر یہ اہم، وقیع، نا قابل قدر ہے تو افسانوں کو ایک خاص زور، ایک تاثیر بخش دیتی ہے۔ اگر افسانہ نگار کی شخصیت اوسط درجہ کی ہے، اگر اس کا مشاہدہ، اس کی قوتِ حساسہ، اس کا دماغ یہ سب چیزیں اوسط درجہ کی ہیں تو پھر وُہ اوسط درجہ کا افسانہ نگار ہو گا اور اس کے افسانے بھی اوسط درجہ کے ہوں گے۔ لیکن اگر اس کی شخصیت وقیع ہے، پھر ہر لفظ با اثر اور مکمل افسانہ بے نظیر ہو گا۔

میں اختر کے افسانوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ اختر نوجوان ادیب ہیں۔ ان کی شہرت بہار کی حدود میں محدود نہیں۔ ان کی تحریریں ہندوستان کے اکثر و بیشتر رسالوں میں شائع ہوئی ہیں اور شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اختر کے ادبی کارنامے محدود قسم کے نہیں۔ وُہ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں اور نقاد ہیں، اور انہوں نے دو ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں، ان کی نظموں، ان کی تنقیدوں سے اردو دُنیا واقف ہے۔ ان کے

چیزوں میں ایک نیا پن، بے مثالی، بانکپن نہ پیدا کر سکے تو پھر اسی کی محنت تحصیل حاصل ہے اگر اس کا خام مواد افسانہ کی صورت میں بھی خام مواد باقی رہے تو پھر اس کا افسانہ افسانہ نہیں کچھ اور چیز ہے۔

افسانہ محض زندگی کا آئینہ نہیں اس میں صرف زندگی کا عکس نظر نہیں آتا بلکہ اس میں زندگی چلتی پھرتی، بولتی چالتی، ہنستی کھیلتی، روتی رلاتی نظر آتی ہے۔ زندگی کی عکاسی کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن زندگی کی ادب میں زندہ تخلیق نہایت دشوار ہے۔ ادب میں زندگی کی نقالی نہیں ہوتی۔ ادب میں زندگی کی عکسی تصویر نہیں ہوتی۔ ادب میں زندگی زیادہ نظر آتی ہے۔ افسانہ بھی ایک صنفِ ادب ہے۔ اس میں بھی زندگی کے کسی پہلو، کسی رخ، کسی حصہ میں روحِ زندگی پھونک دی جاتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر افسانہ نگار نے محض سطحِ زندگی کی نقالی کی یا اس کی صحیح مفصل تصویر مرتب کر لی تو اس سے وہ کامیابی کا مستحق نہیں ہوتا۔ عموماً سطحِ زندگی کی نقالی یا عکاسی کو کافی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال صحت پر مبنی نہیں۔ محض جزئیات کے مشاہدہ، ان کے صحیح انتخاب، ان کی ترتیب و ترکیب سے سطحِ زندگی کی نقاشی ممکن ہے۔ لیکن ایسی نقاشی کوئی ادبی اہمیت نہیں رکھ سکتی۔ جب تک کہ اس میں "کچھ اور" بھی موجود نہ ہو۔ کسی واقعہ یا واردات کا صحیح و مکمل بیان پولیس کی رپورٹ میں مل سکتا ہے۔ لیکن اس رپورٹ کی کوئی ادبی وقعت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کسی افسانہ میں کسی واقعہ یا واردات، کسی "کیریکٹر"، کسی فضا کی صحیح و مکمل "رپورٹ" جزئیات کی صحت کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس میں "کچھ اور" نہیں تو پھر یہ افسانہ بھی ایک "رپورٹ" سے زیادہ

افسانے خصوصاً نہایت مقبول ہیں۔ نقاد کا فرض محض رہبری ہے۔ میں نے افسانوں کے بنیادی اصول پر روشنی ڈالی ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اختر کے افسانوں کا ان اصول کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے۔ ان افسانوں میں سے زیادہ تر "معاصر" میں شائع ہو چکے ہیں ان کا معاصر میں شائع ہونا ہی ان کی اچھائی کی دلیل ہے، میں یہاں آل احمد سرور صاحب کے چند جملے نقل کرنے پر قناعت کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں "اختر کے افسانے مجھے پسند آئے۔ اختر کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ خارجی اور داخلی ہر قسم کی مصوری کر سکتے ہیں۔ کردار نویسی کے گر سے بھی واقف ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دراصل کچھ کہنا ہے اور یہ ایک بڑی بات ہے"

کلیم الدین احمد

پروفیسر پٹنہ کالج

ٹائپسٹ

مَیں نے بی۔اے پاس کیا۔ ایم۔اے کی ڈگری لی اور اُس کے بعد میری نظر اخبارات کے "ضرورت ہے" والے کالموں پر رہنے لگی۔ پہلے پہلے تو صوبجاتی گزٹ میں ڈپٹی مجسٹریٹی اور پولیس سپرنٹنڈنٹی کی اسامیوں کے اعلان کو ڈھونڈھتا تھا۔ مگر اب "ہر چہ بادا باد" کے اصول پر عمل کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں مَیں نے چند ملازمتوں کے اشتہار دیکھے اور جھٹ درخواستیں لکھ کر انہیں ٹائپ کرانے کی فکر میں لگا۔ ٹائپ نویسوں کی کیا کمی، ہاں مگر میری جیب میں پیسوں کی تو کمی تھی۔ مجھے کسی ایسے ٹائپسٹ کی تلاش تھی جو کم اجرت پر میرا کام کر دے۔ میرے ایک دوست نے میری رہنمائی کی اور ایک ٹائپسٹ کے یہاں مجھے لے چلا۔

ہم لوگ چوک سے گذر کر گلی در گلی ہوتے ہوئے ایک نیم ویران محلہ میں پہنچے۔ ہر چند کہ یہ بد قسمت

محلہ شہر کے اندر ہی تھا مگر شہر کے تمام چم و خم، چمک دمک، بھیڑ بھاڑ سے معرا تھا۔ سنسان، اداس بےہوش سا لٹا ہوا۔ شہر کے پُر رونق بازاروں، وہاں کی سربفلک عمارتوں کے مقابلہ میں یہ آشفتہ حال محلہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دن کے مقابلہ میں رات معلوم ہوتی ہے مگر دولت کی راتیں بھی پُرکیف اور شاداب ہوتی ہیں اور یوں بھی راتیں فطرت کے عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہیں مگر اس بدبخت محلہ کو غربت کی تیرگی نے اور تاریک کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں کی ویران حالی اور شہر کی عام آبادی کا تقابل بہت نمایاں ہو کر اثر انداز ہو رہا تھا۔ مٹی اور اینٹ کے شکستہ مکانات نیچے نیچے پائے، مکانات کے درمیان ملبوں کا ڈھیر، گھروں کی شکستہ و نیم شکستہ دیواریں اکثر جگہ ان بڑے بڑے رخنوں کو ٹاٹ کی چٹائیوں سے پاٹا گیا تھا مگر کہنہ چٹائیاں بھی جھرجھری ہو رہی تھیں۔ چھپر جھکے جاتے تھے۔ چہار دیواریاں مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھیں گلیوں میں کوڑے کے ڈھیر تھے جن میں محلہ کے میلے کچیلے، نحیف و زار، بدشکل بچے بکھرتے پھرتے تھے۔ گھر کے اندر کی نالیاں سیاہ، بدبودار کیچڑ گلیوں میں لا کر اس طرح بکھیرتی تھیں جیسے کوئی سیاہ دل ظالم بدکار دنیا میں گناہ اور فسق و فجور بکھیرتا ہے۔ محلہ میں چہل پہل بالکل مفقود تھی۔ موت کی سی ایک منحوس اداسی ہر طرف چھا رہی تھی۔ اکا دکا کوئی گلیوں میں نظر آ جاتا تھا۔ سر جھکا ہوا، آنکھیں مایوس، بےرونق، نڈھال، پریشان حال کپڑے پھٹے ہوئے۔ اِدھر اُدھر گندے اور ٹوٹے پھوٹے اساروں پر چند بدبختی اور افلاس کے فتریکبہ حال بیٹھے نظر آ جاتے۔ بیچ میں ایک حقہ ہوتا نیچہ ٹوٹ کر دوہرا ہوا جاتا، مٹی کی چھوٹی ہوئی گڑگڑی رِس رِس کر تمباکو کا متعفن پانی بہا رہی تھی۔ جس سے اُسارے

کی خاک مل کر کیچڑ پیدا کر رہی تھی۔ چلم کا حلقہ ایک طرف سے فتح شدہ فصیل کی طرح ٹوٹا ہوا تھا جس کے اندر سے نیم فسردہ خاکستری ٹکیاں کسی بجھتی ہوئی چتا کی مانند نظر آ رہی تھیں ہر طرف دکھ، بدنصیبی، روگ کے مجسمے دکھائی دیتے، ہر سو اجاڑ پن، بربادی اور نحوست کے دیوتے آنکھوں کے سامنے آتے، یہ محلہ سود خواطہ نظام کی آنکھ کا موتیا بند تھا۔ تہذیب و تمدن کے جسم کا کوڑھ اور انسانیت کے جگر کا پھوڑا۔ دیہاتوں میں تو سود خواری کے انسانیت کُش دانتوں سے دہقان کے دل و جگر میں بنائے ہوئے زخموں پر مادرِ فطرت اپنے ہاتھوں سے مرہم رکھتی ہے مگر تمدن کے قلعوں میں سرمایہ داری کے حریص، قاتل پنجوں کے شکار بسمل ہو کر ا تڑپ تڑپ اور سسک سسک کر جان دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور اُن کا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔

اس ستم رسیدہ محلے کے شمال میں قرض دینے والے سکھوں کی آبادی تھی اور اس سے پرے مہاجنوں کا ٹولہ۔ یہ بڑے بڑے مہاجن تو ان نیم مردہ شکاروں کو پوچھتے نہیں۔ ان کے تیرِ ستم کے نشانے تو عیش پرست رؤسا ہوتے ہیں۔ رہے یہ نصیبوں جلے تو ان کے جسم کا خون یا تو چھوٹے سرمایہ کے سکھ سُود خوار چوستے ہیں یا سخت دل کابلی۔ میں اور میرے دوست نے اس نیم جاں محلہ میں ایک دو مظلوم گھروں کے دروازوں پر کٹار بند سکھ قرض لگا لینے والے کو تقاضہ کرتے ہوئے اور لٹھ والے کابلیوں کو اِدھر اُدھر اس طرح گشت کرتے دیکھا جیسے باز اور شکرا اپنے شکار پر منڈلاتا ہے۔

آخر کار ہم لوگ ایک شکستہ مکان کے سائبان کے نیچے رُک گئے۔ یہ ایک سہ درہ لانبا سا

سائبان تھا۔ خام پائے اور خام دیواریں۔ چھپر رکوع کی حالت میں۔ سائبان میں بائیں جانب ایک ٹوٹی ہوئی چوکی بچھی ہوئی تھی۔ کسی ڈوبتی ہوئی طوفان زدہ کشتی کے تختوں کی طرح اس کے تختے بھی اکھڑے جاتے تھے اور ایک کنارے کا تختہ تو اکھڑا ہی ہوا تھا۔ دیوار کے گوشوں میں مکڑی کے جالے تھے اور اوپر کی طرف جھول۔ سائبان سے لگی ہوئی ایک کوٹھری تھی جس کے اوپر ٹاٹ کا میلا سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ دائیں جانب ایک پلنگڑی بچھی ہوئی تھی، جس پر ایک پھٹا ہوا گدا اور ایک کہنہ رضائی رکھی ہوئی تھی۔ رضائی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی مٹیالے رنگ کے اَستر اور ابرے کے اندر سے میلی روئی برص کے داغوں کی طرح جھانک رہی تھی سائبان کے بیچ میں ایک لڑکھڑاتی میز اور اس سے لگی ہوئی ایک کمزور سی کرسی۔ کرسی پر ٹائپسٹ بیٹھا ہوا تھا اور میز پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا۔ ٹائپسٹ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ڈاڑھی منڈی مگر حجامت کے لئے ترسی ہوئی۔ سانولا رنگ۔ چوڑی ہڈی مگر ڈھیلا ڈھالا چہرے پر شکن، ماتھے پہ بل، ناک پر ایک پرانی سی عینک جس کی ٹوٹی ہوئی کمانیوں کو دھاگے سے جوڑ لگیا تھا۔

شروع جاڑے کا زمانہ تھا مگر اس ہفتہ میں بارش ہو جانے کے سبب سے سردی چمکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین کی ساری حدت بادل بن کر اڑ گئی اور اب کھلا ہوا نیلا آسمان صرف سردی برسا رہا تھا۔ صبح کے دس بج چکے تھے مگر ہم لوگ بھی جو کوٹوں میں لپٹے ہوئے تھے خاصی ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے۔ غریب ٹائپسٹ صرف ایک واسکٹ میلی سی قمیص کے اوپر پہنے ہوئے تھا۔ سائبان گلی کے مشرقی جانب واقع تھا۔ صبح کو وہاں دھوپ

کاگذر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اور شام کو آفتاب اِس طرح سے وہاں سے اپنا دامن بچا کر نکل جاتا تھا جیسے امیر لوگ غریبوں سے کتراتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ جگہ مرطوب تھی۔ ٹاپیسٹ تھر تھر کانپ رہا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے سردی کی اتنی پروا نہیں جتنی فکر اُسے کسی اور امر کے متعلق ہے۔ وہ کسی خیال میں غلطاں و پیچاں معلوم ہو رہا تھا۔ دماغ میں جب کوئی تجویز کامیابی کی جانب اقدام کرتی ہے تو چہرے پر باوجود غور و فکر کے آثار کے ایک زندگی بداماں روشنی اور ایک مسکراتا ہوا رنگ کھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس وقت ادھیڑ عمر ٹاپیسٹ کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ اس کی گہری ہوئی آنکھوں سے مایوسی ٹپکی پڑتی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک ایسے دل کی ترجمانی کر رہی تھیں جس میں امید کا دیا بجھ گیا ہوا۔ اُسکے تھکے ہوئے دماغ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب ایک بھی کامیاب تجویز کی کرن نور افشاں نہیں وہ اس بھٹکے ہوئے جہاز راں کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کا رہبری کرنے والا استارہ ڈوب چکا ہو۔ اس کی خیالی تگ و دو اس مسافر کے اٹھتے ہوئے قدموں کے مانند نہ تھی جو منزل کی طرف سیدھی سڑک پر بڑھ رہا ہو۔ بلکہ کسی غار میں گرے ہوئے اندھے راہرو کی طرح جو ایک ہی حلقے میں چکر کاٹتا ہو کبھی تھک کر بیٹھ جاتا ہو اور کبھی اُٹھ کر بے مطلب امید موہوم کے پیچھے چلتا ہو۔

ہم لوگوں نے سائبان میں قدم رکھا۔ ٹاپیسٹ چونک پڑا۔ اُس نے چشمہ کے اوپر سے دیکھا میرے ہاتھ میں درخواست کا مسودہ اور سندوں کا پلندہ تھا۔ ٹاپیسٹ کی نظریں اسطرف پڑیں جیسے برسوں کا بیمار ناامیدیوں کے طمانچے کھایا ہوا بیمار طبیب کی آمد سے ایک لمحہ کیلئے مسرور ہو کر پھر اتھاہ یاس کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اِسی طرح یہ ٹاپیسٹ بھی ایک آن کیلئے

خوش ہو کہ مایوس سا ہو گیا۔ اس کے پاس کون ٹائپ کرانے آئیگا ہفتہ اور مہینے گذر جاتے ہیں کوئی ادھر نہیں پھٹکتا کچہری میں البتہ گاہے گاہے کوئی آجاتا ہے۔ نووارد کے ہاتھ میں کوئی دوسرا کاغذ ہوگا۔ یہ کسی کے مکان کا پتہ پوچھتے ہونگے۔ ٹائپسٹ کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی گاہک آیا ہوگا۔

میرے دوست نے بتایا کہ یہ ٹائپسٹ ہے تو کارواں مگر بے چارے کی مشین بے حال ہے حروف ذرا اوپر کی جانب اُڑے ہوئے چھپتے ہیں۔ دوسرے افلاس کے سبب مشین پر زنگ روغن بھی نہیں کرا سکتا۔ اپنی صورت سے بھی بدحالی ٹپکتی ہے۔ اور اس دور میں کہ لوگ ظاہر کی ٹیپ ٹاپ پر بہت جاتے ہیں۔ اسے کچہری میں کون پوچھتا۔ ایسے ہی کوئی غریب گاہک، ہر جگہ سے رد کیا ہوا آجاتا ہے تو اُسے کبھی کبھار کام مل جاتا ہے۔ اور اِسکے گھر پہ تو سوائے قرضخواہوں کے کبھی کوئی آتا نہیں۔ مفلوک الحال ٹائپسٹ دوسری مشین بھی نہیں خرید سکتا روپئے کہاں سے آئیں۔ بال بچے ہیں، بیوی ہے۔ روزینہ تو نکلتا نہیں پس انداز کس طرح ہو اسے جو نئی مشین مل جائے اور ذرا اس کے کپڑے لتے درست ہوں تو کام چل نکلے۔ آدمی لیاقت کا ہے غلطیاں بہت کم کرتا ہے۔ اور کام جو چل پڑے تو پیٹ بھی بھرے، قرض کی ادائیگی کی صورت بھی پیدا ہو۔ مگر بیچارہ ٹائپسٹ تو ایک منحوس دائرہ میں گردش کر رہا ہے۔ غربت و افلاس کے سبب مشین بُری، حالت زبوں، اور صورت بے کشش بُری مشین اور تباہ حالت کی وجہ سے افلاس کی عمارت پر فلاکت کی اینٹ پر اینٹ پڑتی جاتی ہے۔ یہ بدبختی کا چکر چلتا رہا ہے اور چلا جا رہا ہے۔

سائبان کے اندر پہنچکر میں نے جلد ہی ٹائپسٹ کی حالت انتظار کو رفع کیا میں نے کہا "جناب من! میں چند درخواستیں ٹائپ کرانے آیا ہوں" جب شکستِ تمنا روزمرہ کا معمولی واقعہ ہوکر رہ جاتی ہے تو پوری ہونے والی توقعات کے بارے میں بھی کوئی امید نہیں بندھتی۔ ٹائپسٹ کو یہ ساری باتیں خواب کی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ خاموشی اور حیرت سے ہم دوگوں کی طرف دیکھتا رہا میں نے میز پر درخواستوں کے مسودے رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب مجھے چند چیزیں ٹائپ کروانی ہیں" ٹائپسٹ کو اب یقین آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے حقیقت ہے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی روشنی چمکنے لگی، جیسے بجھتے ہوئے دیئے میں کوئی تیل ڈال دے اور وہ چمک اٹھے۔

میرا دوست مجھ سے رخصت ہوا اور میں پلنگڑی پر بیٹھ گیا۔ ٹائپسٹ نے مشین سنبھالی۔ اس میں کاغذ لگایا اور ایک درخواست کو غور سے پڑھ لینے کے بعد ٹائپ کرنے لگا کھٹ کھٹ ۔۔۔۔۔ کھٹ کھٹ ۔۔۔۔۔ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ ۔۔۔۔۔" وہ ٹائپ کر رہا تھا اور میں گرد و پیش کا خاموشی سے جائزہ لے رہا تھا۔

مرطوب سائبان کی دیواریں چولھے کے دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ کونے میں چولھا ایک گرسنہ فقیر کی طرح منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ نہ جانے کب سے چولھے کا پیٹ نہیں بھرا تھا۔ چولھے کے منہ میں لکڑی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اور نہ کوئی بجھا ہوا کوئلہ۔۔ صرف کچھ راکھ بکھری ہوئی تھی اور بس۔ ہر چند کہ سائبان سے ملی ہوئی کوٹھڑی پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا مگر وہ صاحبِ نگاہ نہ تھا۔ کوٹھڑی تاریک تھی اور ہوا سے بالکل محروم۔ وہاں ایک کھٹولا بچھا ہوا تھا

اور کھٹولے سے لگا کوئی بیٹھا ہوا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کھاٹ پر کوئی مریض لیٹا ہوا ہے
یہ تھی ٹائپسٹ کے گھر کی کائنات۔ گلی کے دوسری جانب ذرا سامنے سے ہٹ کر ایک نانبائی کی
دوکان تھی۔ میلے کچیلے المونیم کے برتن بد سلیقگی سے بکھرے ہوئے تھے کسی کا کنارہ غائب، کسی کا
دستہ ٹوٹا ہوا۔ تام چینی کے برتنوں کی چھتین اکھڑی ہوئی۔ رکابیوں پر سوکھے ہوئے بسکٹ، نان خطائی اور
میلے میلے سموسے رکھے ہوئے تھے مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ نانبائی میلے چکٹ کپڑوں میں لپٹا
ہوا دوکان پر اونگھ رہا تھا۔ دوکان کے نیچے دُبلے اگرسنہ، دو کتے زمین پر روٹیوں کے بچے
کھچے ٹکڑے اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں تلاش کر رہے تھے۔ میں گرد و پیش نظر ڈال ہی رہا تھا
کہ پلنگڑی کے موٹے موٹے کھٹملوں نے مجھے کاٹنا شروع کیا۔ میری توجہ اس طرف پھر گئی میں نے
دیکھا کہ کئی موٹے موٹے کھٹمل میرے کپڑوں پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اُف وہ کھٹولی ان موذیوں
کی گڑھی تھی۔ اب جو پھر میں ٹائپسٹ کے گھر کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے کوٹھڑی کے اندر سے کسی
کے سسک سسک کر رونے کی آواز سنائی دی۔ ٹائپسٹ بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ اور فوراً اُٹھ
کر وہاں چلا گیا۔ میں منتظر تھا کہ وہ آئے تو ماجرا پوچھوں۔ وہ آیا بدحال پریشان، دلگیر اگر یہ خاموش
کی صورت میں نے حالت پوچھی۔ کہنے لگا: "جناب! میرا بچہ ایک ہفتہ سے بیمار تھا، کل رات
سے اُس کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ محلہ کے ایک حکیم صاحب کو دکھلایا تھا۔ وہ نمونیہ
بتلاتے ہیں مگر صاحب پیسے کہاں جو دوائیں خریدوں۔ کسی ڈاکٹر کو بلا سکتا نہیں سوائے
صبر کے کیا چارہ ہے۔ ابھی اُس کا بخار بڑھ گیا ہے۔ وہ اپنی ماں تک کو اب نہیں پہچانتا۔
ٹائپسٹ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ وہ پھر ٹائپ کرنے لگا۔ اُسے یہ اُمید

بندھی ہوگی کہ پیسے مل جائیں گے تو بھاگ کر حکیم صاحب کے ہاں سے دوا لے آؤں گا۔ وہ تیز تیز ٹائپ کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ فطرت بھی کتنی ظالم ہے۔ جس طرح ٹائپسٹ کی انگلیوں کے اشارے پر ٹائپ رائٹر کی سلائیاں اُٹھتی ہیں اور گرتی ہیں اور ٹائپسٹ جو چاہتا ہے سفید کاغذ پر اُن سے لکھوا لیتا ہے، اُسی طرح اِنسان بھی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ فطرت کا ہاتھ اُسے جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے اور اُسے چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی مگر کیا فطرت واقعی ظالم ہے؟ میرے دماغ نے پھر غور کیا۔ فطرت ظالم ہو مگر اِنسان اِس سے زیادہ ظالم ہے۔ فطرت کا قانون سب کے لئے یکساں ہے اور سرمایہ داروں کا بنایا ہوا قانون غریبوں کو پیسے جاتا ہے۔ سود خواری کے کولھو میں اِنسانیت پیری جا رہی ہے۔ زلزلہ امیر اور غریب کیلئے یکساں آتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے فطرت سیلاب اور زلزلوں کے ذریعہ غربا اور مظلوم فقرا کی ناقابلِ برداشت تکالیف کا خاتمہ کر دیتی ہو اور تہذیب و تمدن کے فرعونوں اور اینائے اور پاپ کے راوتوں کو سبق سکھاتی ہو مگر دولت کا قانون غریبوں کے لئے عرصۂ حیات تنگ کرتا جا رہا ہے اور امیروں کی جیبوں میں زر اور دماغ میں غرور و تکبر بھرتا جاتا ہے۔ میرے دماغ میں مختلف خیالات ہجوم کر رہے تھے۔ یک بیک خیال آیا کہ میں ٹائپسٹ کی اجرت پہلے ہی کیوں نہ دیدوں۔ تاکہ وہ جا کر دوا لے آئے۔ کام وہ بعد میں کرتا رہے گا۔ میں نے جیب سے پیسے نکالے اور ٹائپسٹ سے کہا "یہ پیسے لیجئے مطب سے جا کر دوا لے آیئے" اُس کی آنکھوں سے شکر و احسان مندی کا جذبہ ٹپکا پڑتا تھا۔ اُس نے کام چھوڑ دیا اور

پیسے لے کر اٹھا کہ جا کر دوا لے آئے۔

ٹائپسٹ ابھی سائبان سے باہر نہیں نکلا تھا کہ ایک سکھ مہاجن کہ پان لیتے ہوئے بلا کی طرح نازل ہوا۔ جیسے کبوتر کا خون بلی کو دیکھ کر خشک ہو جاتا ہے اور طاقت مدافعت نہ رہنے کی وجہ سے آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں بالکل اسی طرح ٹائپسٹ کے اوسان خطا ہونے لگے۔ سکھ نے آتے ہی کہا۔ "کیوں جی! اس مہینہ کا سود مجھے نہیں دوگے؟ ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا۔ اسی وجہ سے میں نادہندوں کو قرض نہیں دیتا۔

سکھ نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر ٹائپسٹ کی طرف یہ کہتے ہوئے لپکا۔ . . . . "تمہارا کام تو چل رہا ہے اور تم پیسے نہیں دیتے دیکھوں تمہاری جیب" یہ کہتے ہوئے اُس نے ٹائپسٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سب پیسے نکال لئے۔

ٹائپسٹ بے حس و حرکت ایک برق زدہ کی طرح کھڑا رہا۔ سکھ کہنے لگا۔ "ارے یہ تو سود کا ایک چوتھائی ہوا۔ اور نکالو پیسے" یہ ہو ہی رہا تھا کہ کوٹھڑی کے اندر سے ڈھاڑیں مار کر رونے کی آواز آئی۔ ٹائپسٹ پلٹ کر اندر کی طرف بھاگا۔ رونے کی صدا سہم آہی گئی۔ میں پریشان، دکھی، غصہ میں بھرا کھڑا تھا۔ ٹائپسٹ دوڑ کر واپس آیا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتا ہوا کوٹھری کے اندر لے چلا۔ "جناب میرا بچہ . . . . دیکھیے تو ذرا آپ اس کی نبضیں . . . . بند ہو گئیں کیا؟" سکھ کچھ سمجھ کر چلا گیا۔ میں نے اندر

جا کر دیکھا کہ لڑکے کی ماں روتے روتے بے حال ہوئی جارہی ہے۔ بچّہ بے سدھ پڑا ہے۔ میں نے نبضیں دیکھیں۔ وہ چلتے چلتے تھک کر ڈوب گئی تھیں مریض دنیا کے جوروظلم سے آزاد ہو چکا تھا۔

ٹائپسٹ نے بدحواسی کے عالم میں کہا: "ہائے میرے بچے! میں تیرا علاج بھی نہ کر سکا تو روٹھ کر چلا گیا اور اب کفن دفن کے لئے بھی میرے پاس کچھ نہیں" ٹھیک اُسی وقت تین بچے کھیل سے فارغ ہوکر روتے ہوئے آئے "اماں کھانا! اماں کھانا!" ان معصوموں کو کیا معلوم کہ زندہ رہنے کے لئے ان کے والدین پیسے کہاں سے لائیں جب مرنے کے لئے بھی اُن کے پاس پیسے نہیں۔

آخری اِکنّی

"رنگون ہیر سیلون" کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا سہیلؔ ماضی کی خاکستر میں چنگاریاں تلاش کر رہا تھا۔ حجام کے استرے سے کھر کھر کی آواز آ رہی تھی۔ ایک طرف کی ڈاڑھی آدھی صاف ہو چکی تھی، ٹھڈی اور گالوں کے بقیہ حصّوں میں صابن کا سفید جھاگ لگا ہوا تھا اور باتونی حجام طرح طرح کی باتیں کئے جاتا تھا۔ ٹیوشن کی تلاش میں سہیلؔ نے تین چار روز سے شیو نہیں کیا تھا۔ داڑھی کے سیاہ نوکدار بال سفید جھاگ کے اندر سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے دوبارہ چینی میں کالی چیونٹیاں لگ گئی ہوں۔

"حجور! آپ لوگ سیفٹی سے شیو کر کر کے داڑھی کو کڑا کر دیا ہے۔ سب بابو لوگ کو دیکھا سردی میں نرم نرم داڑھی۔ بلیڈ لگا نہیں کی کانٹا کی طرح کڑی" حجام نے لطیف انداز میں اپنا

پروپیگنڈا کیا۔ سہیل خاموش بیٹھا ہوا عالمِ تصوّر میں غرق تھا۔ اور ٹیبل پر بجلی کا پنکھا مسلسل فر فر کرتا ہوا گردش کر رہا تھا۔

" زہرہ کی تعاقب کرنے والی نگاہیں! کتنی موثر نگاہیں! میرے دل میں ایک مدہوش کن احساس کی کیسی لطیف لہریں اٹھی تھیں چنبیلی کی طرح سفید رنگ اور اُس پر گلابی گلابی دہک سی" سہیل کے دل میں پھر لہریں اُٹھنے لگیں ——" بھولی بھالی سی زہرہ مگر اس بھولے پن میں کتنی ہوشیاریاں پوشیدہ تھیں۔ اُف! وہ چونکی ہوئی معصومیت! اس کی محبت انگڑائی لیکر اُٹھی تھی۔ اُس نے کتنا خلوص مجھ پر نچھاور کیا تھا۔ وہ میرے لیے کتنی بیتاب تھی۔ کن کن بہانوں سے وہ میرے قریب آکر بیٹھتی۔ اُس کی نازک بیل جیسی انگلیوں کا میری انگلیوں سے مَس ہونا۔ دانستہ۔ پھر میری جرأتیں —— ہاں میری اُنہی جرأتوں میں تو اس کی کامیابی پوشیدہ تھی۔ میں اُس کی میز پر بیٹھ کر خط لکھتا۔ یا کسی مضمون کے مکمل کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا اُس کا کہنیاں ٹیک کر میز پر اس طرح جھک جانا کہ اس کا کھلا ہوا چہرہ۔ اُس کی نرم اور چکنی ہتھیلیوں پر رکھا ہوا چھپے ہوئے نازک پتّوں کے درمیان کنول کا پھول معلوم ہوتا کتنا دلفریب ہوتا تھا وہ منظر! ——"

"کھر کھر" حجام کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا اور اتنی ہی تیزی و تسلسل سے اسکے لب بھی ہل رہے تھے ——" جمورا بسنا کی اُپج یا بو کو نوکری نہیں ملی۔ بی۔ اے، ایم۔ اے وکالت آجکل کے زمانے میں سب بیکار۔ رحمت بابو سنگھ بابو۔ مکرجی بابو۔ پھیلو بابو۔ رام نرائن بابو کس کس کا نام بتا دیں سب نوکری کے لیے پیروی کرتے کرتے تھک گئے۔ بابو کورٹ اور ہوٹل کا

کھرچا کتنا مشکل ہے؟ پال بابو نے تو درجی کا دوکان کھول لیا۔ مگر ہاشم بابو کے پسر ہٹے کی دوکان بھی فیل ہو گئی۔ سچ کہتے ہیں سہیل بابو، کر گہہ چھوڑ گڑ بتی۔ کہاں تو ام۔ اے۔ بی۔ اے بیس، گڈ، بیری پل، اور کہاں آٹا دال کا بھاؤ! ۔ ۔ ۔ ۔"

سہیل نے سُنی اَن سُنی کر دینی چاہی، مگر حُسن کے رنگین تصوّر میں بھی وہ غمِ روزگار کو غرق نہ کر سکا۔ اِس کے دماغ کے تاریک گوشوں سے نئے خیالات اُٹھنے لگے جیسے کوئی نشے سے ہوش میں آنے لگے۔ ماضی کی دلکشی کا فریب ٹوٹنے لگا۔ اور حال؟ غیر یقینی، دُھندلا، بے اُس، فسردہ، ناکام۔ اِسی بے روزگاری کے عفریت نے ہی راون کی طرح زہرہ کو اس سے چھین لیا تھا ــــــ سیلون کا حجام ریڈیو میں فٹ بال میچ کی روئداد بیان کرنیوالے کی طرح مسلسل بولتا جا رہا تھا، مگر سہیل کے تخیّل کا قلم اُس سے بھی زیادہ تیز چل رہا تھا۔

"زہرہ! بے روزگاری! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ! مگر حُسن کی رعنائیوں سے کتنی زیادہ اہم زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں، ۔ ۔ ۔" ماضی کے زرّیں لمحات کا تصوّر نہایت تیزی کے ساتھ گزر گیا اور اس کی تاریکیاں حال کی الم انگیزیوں سے ملکر اور بھیانک ہو گئیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محبّت بھی شاید ایک موسمی پھول ہے۔ کھلا اور مرجھا گیا۔ زہرہ کیسی بدل گئی! اس کی آنکھوں کے افق میں محبت کے ستارے اب نہیں جگمگاتے۔ بی۔ اے کی ڈگری، کانووکیشن، زہرہ کے گلنار کی طرح سُرخ و نرم لب، اس کا گداز جسم ابھرے ہوئے سینوں کا زیر و بم، پھاگن کی دوپہر کی ہوا کی سی گرم و خواب آور سانس ۔ ۔ ۔ ۔" سہیل گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا کھو سا گیا، وہ زہرہ کی سانس کی گرمی اور اس کے لبوں کی حلاوت

اب بھی محسوس کر رہا تھا۔

"مجبور آپ کی نوکری کب تک ہوگی ؟" آپ پہ زور دیتے ہوئے سیلون کے حجام نے دریافت کیا۔

سہیل چونک پڑا ، جیسے کسی کی آہٹ پاکر اُس نے زہرہ کو اپنی آغوش سے علیحدہ کیا ہو مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا ——— وہ پھر سوچنے لگا ——— شکستِ فریب : بیروزگاری : بیکاری کا سوچ ۔ دو سال تک ملازمت کے لئے جد وجہد ۔ امیدوں کی بھول بھلیاں ، ناامیدی کا بس ، حال کا کھوکھلا پن ۔ طنز کناں ماضی کے قدموں کی آہٹ اب تک سنائی دے رہی تھی۔

"کیا کروں ! ام۔ اے لوں تو کیونکر لوں ٹیوشن ، مل جاتی تو شاید میں یہ آخری کوشش بھی کر لیتا ۔ ٹیوشن ، کھانا اور دس روپے ۔ ام ۔ اے کی فیس ۔ ایک اور ٹیوشن ۔ شاید کوئی صورت نکل آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

داڑھی منڈ چکی تھی ۔ پھٹکڑی لگانے کے بعد حجام نے پف کو پوڈر میں مس کر کے سہیل کے رخساروں پر ملا ۔ سہیل بڑے آئینہ میں منعکس تصویروں کو بے دلی سے دیکھ رہا تھا ۔ سینما کے ستاروں کی تصویریں ۔ کانن ۔ دیویکا رانی اور لیلا چٹنیس ۔ کیلنڈر کے مرقعے ۔ جواہر لال ۔ جناح اور دوسرے لیڈروں کی شبیہیں سہیل کی نگاہیں ایک فلم ستارے کی تصویر کے عکس پر جم کر رہ گئیں ۔ اس کے دیکھنے کی ادا کس قدر زہرہ کی ادا سے نظر سے مشابہ تھی پیشانی کی لوح ، چہرے کے بالائی حصے کی تراش ، لبوں کا خم ، سبھی چیزیں زہرہ کی یاد دلاتی تھیں ۔ رفتہ رفتہ فلم ستارے کی تصویر کے عکس کا احساس غائب ہو گیا ۔ سہیل کو ایسا معلوم ہوا کہ زہرہ اس کے سامنے

مبیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں شرمندہ ہیں اور اس شرمندگی میں محبت کی تجدید کا پیغام مچل رہا ہے "چیری بلوسم" کی روح پرور خوشبو چلی آرہی تھی۔ وہ زہرہ کا پاؤڈر۔ زہرہ نے اسے بالکل اپنا بنا لیا تھا۔ اس کے سیمیں رخسار، اس کی مرمریں گردن سے ہوا کی نازک لہریں ہمیشہ یہی جان بخش شمیم چرالاتی تھیں۔ یہی بوئے دلنواز ابھی بھی سہیل کے مشام جاں کو تازہ کر رہی تھی سہیل زہرہ سے باتیں کرنی چاہ رہا تھا۔ مگر ایک سال کی طویل مدّت کے بعد وہ غیریت سی محسوس کر رہا تھا۔ زہرہ اُسے فراموش کر چکی تھی۔ اور ایک مالدار گھر کی مالکہ بن کے وہ غم ہائے روزگار کے مارے ہوئے سہیل کو کبھی کبھار کی ملاقات کے موقع پر بھی نظرانداز کرتی ہوئی گذر جاتی تھی —— سہیل گوناگوں جذبات سے دبا جا رہا تھا اور "چیری بلوسم" کی خوشبو اُس کے سوئے ہوئے ارمان و تمنّا کو بیدار کر رہی تھی، اس کی رُوح ایک خاص سکر، ایک لذیذ اطمینان میں غرق تھی۔ زہرہ اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت ہی ہمت کرکے سہیل نے آہستہ سے کہا، "زہرہ!"

ٹھیک اُسی وقت سامنے بازار میں ایک بے فکرا دور زدہ سے سمع خراشی کر رہا تھا۔

"آہ جالم! مار ڈالا، آنکھ سرمائی ہُوئی"

اس دماغ سوز نغمہ نے سہیل کے تصوّر کا طلسم توڑ ڈالا۔ زہرہ یہاں سے بہت دور کسی مالدار گھر کی مالکہ بنی بیٹھی تھی۔ آئینہ میں صرف فلم ستارے کی تصویریں سہیل کا منہ چڑا رہی تھیں۔ اور ایک گوشہ میں گاندھی جی کی تصویر ہندوستان کی غربت و فلاکت کا مجسمہ بنی سنیہ گرہ کے جالے بن رہی تھی "سیلون" کا حجام سہیل کے رخساروں پر "چیری بلوسم"

کا پاؤڈر مل رہا تھا۔

سہیل کو ٹیوشن مل گئی، مگر صرف ایک۔ اس نے مشکلوں سے ام۔ اے میں نام لکھوا لیا اور نوکری کی مستقل تلاش بھی جاری رہی۔ بات بکھیڑے کی ایک اور تھی ام اے کر لینے کے بعد فوراً ہی اس کی عمر ملازمت سرکاری کے لئے مقرر شدہ معیار سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا وہ اس فکر میں نہایت ہی پریشان رہتا تھا کہ کوئی نوکری بھی جلد مل جائے۔ آفس گردی اور بنگلہ پیمائی اس کا مشغلہ سا ہو گیا تھا — کہیں تو اسے ٹکا سا جواب ملتا، کہیں ڈانٹ کہیں جھڑکی اور کہیں نصیحتیں ملتیں۔ ایسی نصیحتیں، جن کی بے کیفی، کھوکھلا پن اور سرد مہری جھڑکیوں سے بھی زیادہ وحشت ناک ہوتی: "آج کل کے نوجوان محنت سے بھاگتے ہیں۔ تجارت نہیں کرتے امتحان میں اونچے نمبروں سے پاس کرنے کے لئے محنت نہیں کرتے۔ رجسٹراری کے لئے درخواست دیتے ہیں تو ہندی پڑھنے کی مشق بہم نہیں پہنچاتے . . . کھیتی اگر جدید آلات کے ساتھ کی جائے تو پھر بیکاری کیوں رہے۔ یورپ کو دیکھو۔ ہندوستان کے نوجوان سائنس اور صنعت میں بہت پیچھے ہیں۔ صابن بنانا، دوا سازی، ارنڈ کی کاشت۔ کٹ پیس کا بیوپار، یہ سب کرنے کے کام ہیں مگر آج کل کے نوجوان" . . . . . وغیرہ وغیرہ۔ بغرض سہیل کو اطمینان نام کو بھی نصیب نہ تھا، رہنے کھانے اور پڑھنے کا انتظام تو ہو گیا تھا۔ مگر وہ "نیوڈسٹ کالونی" کا ممبر تو تھا نہیں کہ "تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس" پر ایمان لے آتا۔ اسکے والد صاحب ایک بہت بڑے کنبہ کے بہت غریب سرپرست تھے مشکلوں سے سہیل کے

کپڑے لتے کا انتظام ہوتا تھا کسی طرح توڑ جوڑ کر انہوں نے سہیل کو بی۔ اے کرا دیا تھا مگر اب خاندان اور زیادہ بڑا، دنیا اور زیادہ تنگ ہو گئی تھی۔ سہیل بڑی تنگی ترشی سے بسر کر رہا تھا۔

سنیچر کی شامیں خصوصاً فلم کدوں میں ہندوستان کے شہریوں کیلئے مسرت نہیں فریب مسرت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ہماری بے کیف زندگیاں آنی فانی رومانوں کا سہارا ڈھونڈتی ہیں فلم کے پردہ پر حلقۂ دام خیال کے اندر عشق کی رنگینیاں، نغمہ کا ترنم، دلربا صورتیں لہراتے ہوئے پلّو، لچکتی ہوئی کمریں، مٹکتے ہوئے بھرپور کولھے، سہمیں قہقہے محبت کی نیرنگیاں ایک عالم رنگ و بو، ایک فضائے سرمستی و سکر، ایک کیفیت انبساط و خود فراموشی پیدا کر دیتی ہیں ہم زندگی کی تلخ حقیقتوں کو وقتی طور پر بھول جاتے ہیں مگر سینما ہال سے نکلنے کے بعد حقیقت کے کچوکوں کی نشتریت اور قاتل ہو جاتی ہے۔ سینما کی دنیا اور عام زندگی میں ہمارے یہاں ناقابل برداشت تضاد ہے۔ تاہم جہاں کچھ نہ ہو وہاں تھوڑا سا فریب رنگ و نور بھی بہت ہے سہیل کی دنیا تو اور زیادہ تاریک تھی۔ اس کے بیدار احساسات سسکی جاگی ہوئی تمنائیں۔ اسکے افقِ تصور کی وسعت، اس کی تعلیم و تہذیب۔ یہ سب چیزیں دنیا میں تنوع، رنگینی آبادی نشاط اور روانی کی متقاضی تھیں اور سب سے بڑھ کر محبت کی بہاروں میں کھیلا ہوا دل سہیل کو "فردوسِ گمشدہ" کے لئے بیتاب رکھتا تھا۔ اور حاصل اضطراب ہ مایوسی محرومی و ناداری!

سہیل فلم کی جنت گذراں میں کبھی کبھار داخل ہوا تھا لیکن اس کی موجودہ حالت اسے اس سے بھی محروم ہی رکھتی تھی۔ وہ نہ تو ہندوستان کا مزدور تھا کہ شراب کی بھٹی یا تاڑی خانہ

میں جاکر غمِ غلط کرتا اور نہ ایسا فارغ البال طالب علم کہ گویا فلموں کی ہزار داستان سنتا۔ وہ اکثر
سینما ہال کے باہر میدان کے سرے پر ترسنے والوں کے ہجوم کے ساتھ کھڑا رہتا تھا لیکن اب
"رنگون ہیر سیلون" سہیل کے لئے سامانِ صد نشاط تھا۔ وہ اس کی زندگی کے ریگستانوں میں ایک
نخلستان تھا۔ زہرہ سے مشابہ تصویر آئینہ میں جلوہ فگن اور "چیری بلوسم" کی وہ خاص خوشبو۔ اُسکے
لئے پیراہنِ یوسف کی بو تھی اور وہ جلوۂ طور۔ زہرہ اُسے بھول گئی تھی۔ وہ بھول سکتی تھی۔ اُسے
اُس کا موقع حاصل تھا۔ کھاتے پیتے گھر کی مالکہ، گنجی کے جھبوں کی رکھنے والی اور ماماؤں پر حکومت
کرنے والی ایک فلاکت زدہ نوجوان کو بھول سکتی ہے مگر وہ نوجوان ماضی کی عشرتِ رفتہ کو کیونکر
بھول جائے جو اس کے لئے تنہا سرمایۂ نشاط ہے۔ سہیل زہرہ کو بھول کر اپنی زندگی کو بالکل ویران
نہیں کر سکتا تھا۔ چیری بلوسم کی لپٹ اُسے گذرے ہوئے لمحات، جنت نگاہ و فردوسِ گوش لمحات
کی یاد دلاتی تھی۔ اس کی خوشبو کی موجوں کے جھونکے پر جھولتا ہوا وہ ماضی کے پردوں کو چاک کر دیتا
تھا اور سیلون کی چھوٹی سی دنیا میں سہیل زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا تھا۔ جب بھی اُسکے
پاس ایک اکنّی ہوتی اور اس کی داڑھی کو رشید کی ضرورت تو وہ "رنگون ہیر سیلون" کا رُخ کرتا۔
رنگین شیشے لہراتے ہوئے قوس و قزح کے رنگ کے پردے، مسکراتی ہوئی تصویریں، قد آدم شفاف
آئینے، صاف چمکتی ہوئی میز، سفید براق تولئے، بے داغ چمچماتے ہوئے استرے، قینچیاں، بال
تراشنے کی مشین، رنگ برنگ کی کنگھیاں، طرح طرح کے لوشن، تیل اور اُن کی خوبصورت
شیشیاں میز کے سامنے زہرہ سے مشابہ تصویر آئینہ میں جلوہ بار اور چیری بلوسم کی خوشبو، یہ سب
سامان قاف کی پریوں کی طرح یا کسی طلسمی محل کی حسین و جمیل شہزادیوں کی مثال سہیل کو اپنی

طرف اشاروں سے بلاتے تھے اور اکثر وہ ان کے بلاوے قبول کر لیتا تھا۔

موسم گرما کی لمبی چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں سہیل امتحان کی تیاری کے خیال سے گھر نہیں گیا۔ جن صاحب کے یہاں اُس کی ٹیوشن تھی وہ تعطیلات میں شہر سے باہر چلے گئے۔ انہوں نے اتنی عنایت کی کہ اُسے مکان کی ایک کوٹھری میں رہنے کی اجازت دے دی سہیل اپنی کوٹھری میں رہتا تھا لیکن کھانے کا اب کیا انتظام ہو۔ ایک سستے ہوٹل میں اس نے اس کا بڑی مشکل سے اہتمام کیا طے یہ ہوا کہ ہفتہ ہفتہ کھانوں کی قیمت ادا کر دی جائے۔ کیونکہ ہوٹل والے کو طلباء کا بقول اس کے اکثر تلخ تجربہ ہوا تھا۔ سہیل کے پاس پیسے نہ تھے، وہ سخت متفکر تھا۔ قرض لینے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ اپنے والد سے بھی روپے مانگنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ خود بڑی تنگ حالی سے بسر کر رہے تھے مگر آخر وہ کرتا کیا چھٹی ہوتے ہی اس کے ایک آدھ دوست بھی گھر چلے گئے تھے۔ چار و ناچار اُس نے والد صاحب ہی کو خط لکھا۔

ایک ہفتہ گذر گیا مگر سہیل کے والد کے یہاں سے نہ روپے آئے اور نہ کوئی خط ہی آیا۔ ہوٹل والے نے سخت تقاضا شروع کر دیا اور دو تین روز کے بعد اُس نے کھانا کھلانے سے قطعی انکار کیا۔ اب سہیل کے لئے بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔ اُس نے دوسرے ہوٹلوں میں کوششیں کیں مگر بعض نے سرے سے ہی انکار کر دیا اور بعض پہلے ہوٹل والے کے پروپیگنڈا سے متاثر ہو گئے۔ سہیل کے پاس کچھ پیسے تھے۔ بڑی کفایت شعاری سے وہ انہیں کھانے پر خرچ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس ایک آخری اکنی رہ گئی۔

سہیل نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اپنی کوٹھری میں لیٹا ہوا ڈاکیہ کا انتظار سہ پہر تک کرتا رہا شاید والد صاحب کے یہاں سے چند روپے آجائیں۔ ہر آہٹ پر چونک چونک پڑتا اور پھر سوچ فکر میں غرق ہو جاتا۔ امیدوں کا بندھ بندھ کر ٹوٹنا اور ٹوٹ ٹوٹ کر بندھنا۔ وہ اسی کیفیت میں غوطے کھا رہا تھا۔ شام ہو گئی۔ وہ بھوکا تھا اور مضمحل۔ تنہا کوٹھری کی تاریکی میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ زندگی اس کے لئے ایک ظالم کے خواب کی تعبیر تھی اور اس کی رنگینیاں ایک مجنونانہ حقیقت مگر اس حقیقت کے لئے وہ ترس رہا تھا۔ اس کا معدہ خالی تھا۔ اور اُس کا دماغ تخیل سے آباد۔ وہ روپوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا۔ انتہائے مایوسی میں بھوک کے احساس نے بھی دم توڑ دیا۔ وہ تخیل و تصور کے عالم میں پرواز کرنے لگا . . . . . .

" . . . . نوکری، فارغ البالی، اطمینان، ایک گھر چھوٹا سا، خوبصورت سا، پُر امن۔ اس گھر میں زہرہ اور اس کی رعنائیاں، زہرہ کے سُرخ لب، سیمیں بازو، ابھرے ہوئے گول گول چاند کی طرح سفید سینے . . . . . . " انہیں خیالات میں سہیل پر غنودگی طاری ہو ‌ئی اور اسکی آنکھیں جھپک گئیں لیکن بھوک کی شدت نے اُسے تھوڑی ہی دیر میں بیدار کر دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور غیر شعوری طور پر اُس نے چپلیں پہنیں، تکیہ کے نیچے سے اکنی نکالی۔ اور کوٹھری بند کر کے بازار کی طرف چل دیا۔ سڑکوں کی چہل پہل، سجی ہوئی دوکانوں کی جگمگاہٹ برقی قمقموں کی قطاریں فتنوں پر حسن سر رہ گذر کی ارمان خیز ادائیں ایک ایسا منظر پیش کر رہی تھیں جو اس کی ویران کوٹھری کی مایوس فضا سے بہت مختلف تھا۔ اس کے دل میں بھی امنگ سی اُٹھی۔ ایک ہلکی سی موج۔ اس کی کچلی ہوئی آرزوئیں سر اٹھانے لگیں۔ کاش وہ بھی

ان نعمتوں کا حصّہ دار ہوتا! پھر اس نے بھوک کی تکلیف محسوس کی اور اس کے ساتھ وہ ایک اتھاہ نا اُمیدی کے غار میں گر گیا۔ اس کا دماغ سوچنے لگا ——— "یہ بھی کوئی زندگی ہے! سر چھپانا اور بھوک مرنا۔ ایک ہی دفعہ موت کیوں نہیں آجاتی۔ مگر دنیا سے بغیر کچھ لیے ہوئے اُس پر جان کی بھینٹ چڑھا دینی ——— حماقت ہے . . . . . یہ رنگینی، یہ بہارِ شباب! اس میں میرا کچھ حصّہ نہیں ؟ . . . مگر ہے بھی پھر کیوں جیئے جائیے ؟ جیئے جانے کی تہمت برداشت کیجیے ؟ میں بھوکا ہی مر کر جان کیوں نہ دیدوں ؟ یہ حماقت ہی سہی لیکن اس حماقت میں کتنا سکوت ہے، ابدی نجات، زندگی کی بیدردیوں سے آزادی . . . "

سہیل اسی ادھیڑ بن میں "رنگین ہیر سیلون" کے سامنے پہنچا۔ خود بہ خود اُس کے قدم رکنے لگے۔ طلسمی محل کی حسین شہزادیاں اُسے اشاروں سے بلانے لگیں۔ گھٹا ٹوپ بادل کے درمیان ایک ننھا سا روشن ستارہ کتنا دلکش ہوتا ہے۔ سہیل نہ جانے کیسے سیلون کے اندر داخل ہو گیا۔ زہرہ سے مشابہ تصویروں کے جلوے اور چیری بلوسم کی دلنواز خوشبو۔ وہ اپنی حالت کو بھول سا گیا۔ وہ سیدھا بڑھتا گیا اور جا کر گھومنے والی کرسی پر بیٹھ رہا لیکن جب اُس کی نگاہیں حجام سے چار ہوئیں تو اُسے یاد آیا کہ حجام کے کئی آنے جو شاید اب روپیہ بننے والے ہی ہوں، اس کے ذمہ باقی ہیں۔ بس خیال کے آتے ہی اس نے جیب سے آخری اکنّی نکالی اور سامنے کی جھلکتی ہوئی میز پر رکھ دی۔ حجام نے اپنا کام شروع کیا۔ ایک بڑا سا سفید روئیں دار تولیہ اُس نے سہیل کے گلے سے آویزاں کر دیا اور داڑھی میں صابن لگانے لگا ——— "حجور بہت دن کے بعد آئے ؟ کاہے حجور کچھ بیمار تھے؟"

نوفی حجام نے اپنا دوسرا کام بھی شروع کر دیا۔

سہیل یہاں فریبِ عشرت کھانے آیا تھا۔ باتیں کر کے وہ اپنی یکسوئی کو، اپنی تخیل کے
رنگین و نازک جالوں کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آئینہ میں زہرہ کے جلووں کو ڈھونڈھ رہا
تھا۔ اور اس کا خاص پاؤڈر "چیری بلوسم" سہیل اسی شمیم دلنواز کے انتظار میں تھا۔ لیکن آئینہ
میں کچھ ویرانی سی تھی۔ زہرہ سے مشابہ تصویر کا عکس آج اس میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے
آئینہ کے ہر گوشہ کی طرف نظر کی مگر اسے ناکامی حاصل ہوئی۔ اس نے خیال کیا کہ تصویر کسی دوسرے
گوشے میں لگ گئی ہے۔ داڑھی بن جانے کے بعد وہ سیلون کے ہر گوشے میں اسے تلاش کرے گا۔
سامنے آئینہ میں زہرہ سے مشابہ تصویر کی جگہ ایک صحت مند بچہ کا عکس تھا جو برطانیہ بسکٹ
کھا رہا تھا۔ سہیل کو بھی بھوک لگنے لگی۔ اس نے پیٹ میں اینٹھن محسوس کی۔ سامنے جھلکتی ہوئی میز
پر اکنی مسکرا رہی تھی۔ اس کا عکس پیتل کی چمکیلی سطح پر صاف نظر آرہا تھا۔ سہیل "چیری بلاسم" کا
منتظر تھا، جیسے کوئی شرابی دستِ ساقی سے شراب ملنے کا انتظار کھینچ رہا ہو۔ داڑھی بنا کر حجام
"چیری بلوسم" ملے گا۔ آہ! وہ زہرہ کا خاص پاؤڈر! اس نے محسوس کیا کہ اب زہرہ آ رہی ہے۔
اب آ رہی ہے، وہ پردہ میں لرزش پیدا ہوئی، وہ اس کی خاص خوشبو کی لپٹ آئی۔ . . . .
حجام پھٹکری لگا رہا تھا۔ اس نے پف کو پاؤڈر میں غلطاں کر کے سہیل کے رخساروں پر
ملا۔ ایک تیز بو اڑی جیسے ان پاؤڈروں سے اڑتی ہے۔ جو اسپتال میں نرسیں وڈسور پر مالش
کرتی ہیں۔ باتونی حجام نے سوال کیا۔

"حجور! اس لڑائی میں سرکار کا کتنا کھرچ ہوتا ہوگا؟ ہر جگہ سے روپیہ جا رہا ہے

حجور!"

تیز بو کی لپیٹ نے سہیل کو چونکا دیا۔ حجام نے تولیہ سے پاؤڈر ہلکا کیا۔ سہیل کا سر چکرا رہا تھا۔ میز پر چیری بلوسم کے ڈبہ کی جگہ میڈیکیٹیڈ ٹالکم پاؤڈر کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ وہ آخری اکنی مسکرا رہی تھی۔

سہیل کرسی پر سے اٹھا اور بے تابی سے سیلون کے ہر گوشہ میں زہرہ سے مشابہ تصویر ڈھونڈنے لگا۔ جیسے کوئی تھوڑی سی بچی ہوئی شراب کے لئے مضطرب ہو مگر وہ تصویر کہیں نہ تھی۔ سہیل نے محسوس کیا کہ بال بنانے کی مشین اُسے کاٹ کھانا چاہتی ہے قینچیاں اُس کے دماغ کو کتر رہی ہیں اور استرے اُس کے گلے پر چل رہے ہیں۔ آخری اکنّی میز پہ سے طنز آمیز چشمک کر رہی تھی۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کروڑوں روپیہ حضور؟" حجام نے دریافت کیا

سہیل تیورا کر سیلون کے فرش پر گر پڑا۔

بوڑھی ماما

"بابو ایک جروری بات ہے۔ بہت جروری بسنو گے؟"

میں چونک اُٹھا۔ ماما دھیّا میرے لکھنے کی میز سے لگی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے مخاطب کیا تھا میں کچھ لکھنے میں منہمک تھا۔ وہ نہ جانے کب کی یوں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے آتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔ اُس کی آواز سن کر میں نے پلٹ کر دیکھا اور اُسے اپنے سر پر مسلّط پا کر بے اطمینانی کی ایک بے اثر احتجاجی انگڑائی لی۔

میں بوڑھی دھیا ماما سے بہت ڈرتا تھا۔ دنیا بھر کی شکایتوں کا دفتر بے معنی اس کی زبان کی نوک پر رہتا تھا۔ دائی نوکروں کی شکایتیں گھر کے لڑکوں بھڑکوں کے شکوے مختلف لوگوں پر جارحانہ نکتہ چینیاں اور اکثر جملۂ معترضہ کے طور پر ان خوش نصیبوں کے نام سو طرح کی صلواتیں

بھی ہوتیں، مگر حفظ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے شکایتوں اشکوؤں کے علاوہ ماما دھیا کے اپنے
نجی، حقیقی اور خیالی دکھڑے بھی ہوتے تھے۔ ایسی مسلسل گفتگو کے لئے زیادہ تر فسنتوں سے میرا
ہی انتخاب ہوتا تھا۔

یہ بوڑھی ماما کوئی اسّی سال سے اوپر ہی کی ہوگی۔ اُسی کی اپنی روایت ہے کہ پرتیابا اس
کا بیٹا میرے نانا ابا کی برات کے دن پیدا ہوا تھا۔ ماما دھیا نے میرے گھرانے کی تین پشتوں کو
اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ میری بھی کھلائی رہ چکی تھی اور میری والدہ کی بھی۔ اور اب نئی پود کو
سینچ رہی تھی۔ گھر بھر اُسے نانی یا دھیّا نانی کہتا تھا۔ بوڑھی ماما کو ٹال دینا آسان کام نہ تھا۔ اسکی
ایک حیثیت تھی۔ یہیں گھر کا بڑا اگر اس کی بات نہ سنوں تو کون سنے۔ جو سے رُخی برتوں تو پھر وہ میری
عاقبت نہ بگاڑ دے۔ گو دنہ بخشنے کی ایک پوشیدہ دھمکی ہر وقت موجود تھی۔

اب جو میں نے بوڑھی دھیّا نانی کو بے موقعہ وقت پر اپنے سامنے حاضر و ناظر پایا بس لرز ہی
کر نورہ گیا۔ ضروری کاغذات دیکھوں، اہم باتیں لکھوں یا اس کی رام کہانی سنوں۔ مگر کرتا کیا۔ غصّہ
تلخ دوا کی گھونٹ کی طرح پی گیا۔ اور بولا۔

"ہاں نانی کہہ نا کیا کہتی ہے؟"

نانی بولی "کچھ نا بابو۔ یہی تورے پاس آئے تھے ہم پوچھے ہیں۔ پٹنہ میں رہیں کی ناہیں۔
جوڑ سے منصور بابو کے ایہاں سے بھاگے اوڈرہییاں بھی ساتھ لگا رہا۔ توہیں کہہ نہ کہ
ای لونڈہ ان چھیکرن سب ہمرے منہ لگے لا یکھ ہیں؟"......

میں نے کلام کے سلسلۂ لامتناہی کو قطع کرتے ہوئے پوچھا "نانی کہہ نہ ٹھیک ٹھیک

بات! آخر ہوا کیا؟" ــــــــ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح تمّت بالخیر ہو اور میں قلم کی گھس گھس پھر جاری کر دوں۔

بوڑھی نانی نے جواب دیا "یہی مونڈی کاٹا شبر تیا . . . مگر آ گھر ہمرے نبا دیے ہم کہاں جائیں ؟ تورے کھلایا، تورے مائے کو کھلایا منصور کے بچّن کو کھلا رہے ہیں۔ ہائے رشیدا بچوا ہم سے الگ ہوتی رہے ؟ ہم جو آدے لگے تو بھکار مار کے کھوب نہ روئی۔ میرا دل گھوٹ کے رہ گیا۔ ادہی مجھپھر پور کی بیر جن۔ چولہا چکّی سب ادہی کے ہاتھ۔ ہم سے بھلا گھر کا دولت لٹتے دیکھا جائے۔ یہی دو بات بولے۔ اِسی گے گنہگار۔ لوٹ بابو لوٹ! آنکھ پہ پٹی باندھ کے رہیں ؟"

میں بے صبر ہوا جا رہا تھا۔ ذرا زور دیکر میں نے کہا۔ نانی مظفر پور کی بات چھوڑ نہ! یہاں کی کہہ کیا تکلیف ہے ؟ شبر تیا نے کیا کیا ؟" نانی نے سنی ان سُنی کر دی اور پھر چلا چرخا۔ "بیر جن چل موہیں۔ بھی کہی کھڑنی کی شکل کی۔ بابو گھر بھر لیس، گھر ہمرے جاڑا میں پڑسی ناک تو بھرے دیوے نا کرے دو ٹھو کونلہ کی بھی روادارنا ـــــ اور سُنیہو ـــــ لوٹ لاٹ کے بھاگ گئی۔ بچوا سب کو کتنا تکلیف ہوا۔ کوئی کھانا پکانے والا۔ کیسی بے سلّی! . . . . مگر ادگئی تو کا . . . ."

میں نے گھبرا کے ٹوکا "ارے بھائی اصل بات جلدی سے کہہ بھی دے!"

"کھپا ہو گیو بابو؟ ایک بات کہے کھاطر آئے تھے۔ تو آ در بات سب بھی نکل آیا۔ مگر سچّے بابو۔ شبر تیا ہمرے ٹپنوں میں نا رہے دے گا۔ آج تک بھر پیٹ کھانا نا نکالس . . . . آ دراس تا گوڑھی ؟ ستیاناس استیاناس! ایک دم کھاک! ادن بھر ہمرے تنگ کرنا رہے ہے

گھر میں بلّو کے طرح آ دمین اد بلائے چلیں۔ مگر میرے حلک میں کوئی پانی بھی مُرے گھڑی نا ٹپکا وے گا۔ دو گھما گجر گیا اور ہم نا نہانے۔ کوئی ایک چلّو پانی نا بھر وہس۔ مر ٹیو نہ جائیں سب۔ ہیجا ہو سب کو! پلیگ ہو! بلا جائیں سب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

دوسری کوٹھری کی کواڑ کے پیچھے سلمتا یہ سب باتیں چھپ کر سُن رہا تھا۔ میری جو اُدھر نظر اُٹھی وہ دوڑ کر سیدھا دُھب دُھب کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ دھیا نانی جب کبھی میرے پاس گھر کے ملازموں کی شکایات کرنے آتی تھی۔ تو سلمتا سایہ کی طرح اُس کے پیچھے لگا آتا تھا اور ساری رو ئیداد کی اطلاع وہ جھٹ سے جا کر سارے نوکر نوکرانیوں کو کر آتا تھا۔ بوڑھی ما نے تنہا سارے گھر کے ملازمین کے خلاف محاذ قائم کر رکھا تھا۔

" بڑھیا! کھبردار ہمرے سب کے اکو سامت کہ! ہم اکو سابسُن کہ۔ ای گھر میں نوکری نہیں کریں گے۔"

نچلی منزل سے شبر تیا باورچی کی بپھری ہوئی آواز سنائی دی۔ سلمتا نے نیچے جا کر جھٹ کانا پھوسی کر دی تھی۔ "ارے مہجادا! ڈگلے کا جنا ہمکو بڑھیا کہتا ہے رے؟ بڑھیا! بڑھیا! بڑھیا؟ ہوں! ہم فقیرنی ہیں؟ چمار ڈساد ھ کی بڑھیا ہیں؟ دھیا وائی کہنے میں حلک میں بھوکندر ہوئے ہے؟" بوڑھی ماما نے جواباً صلواتوں اور بددعاؤں کی بوچھار کی۔

میں لرز کر رہ گیا۔ اب ایک طویل جنگ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہیں ذرا امن پسند واقع ہوا ہوں اور ایسے نازک موقعوں پر صرف "ارے بھائی جانے دو"، "اب ایسا نہیں ہو گا، ہو گیا ہو گیا۔"، "تم چپ رہو"، "اچھا تم ہی ہٹ جاؤ" وغیرہ قسم کے فقرے مسلسل دہراتا جاتا ہوں۔ یہی میں نے

اس موقع پر بھی کرنا شروع کیا اور اُدھر سے ماما دھیا کا زور شور اور شبراتی کی رُک رُک کر جھنجھم دھاڑ۔

ماما دھیا کو شاید اس اسی برس کے سن میں ریٹائر کرنا چاہئے تھا اور ہم لوگوں نے اُسے سبکدوش کر بھی دیا تھا۔ لیکن وہ دنیا کو تیاگ دینے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اگر کوئی کہتا "نانی بوڑھی ہوئی۔ اب اُس سے کام دھام نہیں ہوگا، چپ چاپ بیٹھی رہے۔ کھائے اور آرام کرے" تو اُسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اس کا مستحکم عقیدہ تھا کہ دنیا کو اُس کی بہت ضرورت ہے وہ اپنی اہمیت ثابت کرنے کیلئے قریباً گھر کی ہر بات میں دخل دینا چاہتی اور دخل دیتی۔ وہ زندگی بھر بچّوں کی کھلائی رہی تھی۔ پر اب بچے اُس سے سنبھلتے نہ تھے۔ بوڑھی ماما کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ ایک آنکھ میں موتیا بند اور دوسری کمزور۔ پھر بھی گویا زبردستی ہی وہ بچّوں کو گود اٹھائے پھرتی تھی۔ ایک دوبار وہ بچے کو لئے زینے پر سے لڑھک بھی گئی تھی۔ لیکن اُس کا الزام اُس نے کسی نوکر کے سر رکھا کہ سیڑھی پر روشنی جلا کر نہیں رکھی گئی۔ یا مالک مکان کو کوسا گیا کہ اُس بدبخت نے ایسی اونچی اونچی بے ڈھنگی سیڑھیاں بنائیں۔ جیوں جیوں اُس کی عمر رواں اُسے انجامِ حیات کے قریب تر لا رہی تھی۔ وہ اتنی ہی زیادہ حریصانہ طور پر زندگی کے ایک ایک لمحے پر اپنی اہمیّت وافادیت نیز تمنائے بقا کی مہر ثبت کرنی چاہتی تھی۔ بوڑھی ماما اکثر دائیوں سے اِس لئے لڑ جاتی تھی کہ اُسے سبزی ترکاریاں چھیلنے کو کیوں نہیں دی جاتیں۔ ہم لوگوں کے گھر آنے پر وہ اپنی افادیت انتظامِ خانہ داری میں دخل دے کر ثابت کرتی تھی۔ دوسری کھلائیوں کو تو اُس نے کبھی قدم جمانے نہ دیا۔ لالچی سرمایہ دار کی طرح وہ اپنے

حلقۂ اثر میں اجارہ داری کی قائل تھی اور دوسروں کے دائرے میں دخل بے جا پر عامل اگر غلطی سے کبھی کوئی کھلائی ٹک گئی تو پھر غضب ہو گیا۔ ماما دھیا اسکے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتی تھی۔ اور پھر نتیجہ معلوم۔ فتح کا جھنڈا ابلا استثنا ہمیشہ بوڑھی ماما کے ہاتھ ہی رہتا تھا۔ ہاں وہ اس کام پر چھوٹے چھوکروں کے رکھے جانے کی روادار ہو جاتی تھی۔ اس طرح منصب سیادت اس کے قبضہ میں ہی رہتا تھا۔ اور وہ حکومت جتا کر اپنی کمزوری اور ناکامی کے تلخ احساس کو بہت حد تک رفع کر لیتی تھی۔ مگر زمانہ بوڑھی ماما کو تیزی سے نیچے گرا رہا تھا اور وہ پھر کر اوپر اٹھنا چاہتی تھی۔ ایک مبہم و غیر متعین لیکن یقینی اور تیکھا جذبۂ انتقام اکثر بوڑھی ماما پر طاری رہتا تھا۔

شاید ابھی بھی بوڑھی ماما کا یہی جذبہ بھڑک اٹھا تھا۔ میں واقعی اس جذبہ کی کارفرمائی سے کانپ جاتا تھا کیونکہ اس کی زد بالواسطہ مجھ پر پڑتی تھی۔ بوڑھی ماما جہاں کہیں رہی اس نے وہاں کے ایک دو نوکروں کو ضرور بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ بڑھاپے میں بقا کی تمنا کے ساتھ بنیادی اسباب بقا کی حرص بھی بڑھ جاتی ہے۔ بوڑھی ماما کو باورچیخانہ سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے خیال میں باورچیخانہ ہی ایسی جگہ تھی جہاں سے زندگی بٹتی ہے وہ اس سرچشمۂ حیات پر قابض و دخیل ہونا چاہتی تھی۔ لہذا باورچی یا باورچن ہی اس کے حملوں کا پہلا نشانہ ہوتی تھی۔ بوڑھی ماما کی یلغار کے سبب کئی بار باورچیخانہ کا ٹاٹ الٹ چکا تھا اور کھانے پینے کا انتظام درہم برہم۔ اس کی تکلیف تو رہی ایک طرف۔ ہوم گورنمنٹ کی گھرکیاں بھی مجھ پر ہی۔

ماما دھیا مسلسل اپنی تیز زبان سے گولہ باری کر رہی تھی اور نچلی منزل سے شبر تب طیارہ شکن توپ کی طرح مدافعت میں باڑھ پہ باڑھ چلا رہا تھا میں نے جھلا کر لکھنے پڑھنے کو تہہ کر کے رکھا ایک طرف۔ اور اب باضابطہ صلح کرانے والے کی شان سے اٹھا۔ مگر ناکامیاب رہا یہ تو ہوم گورمنٹ کو مجھ پر رحم آگیا کہ ایک ڈانٹ رحمت کی گھٹا کی گرج کی طرح سنائی دی اور پھر گھر کا مطلع صاف تھا۔ ماما دھیا کمناتی ہوئی چلی گئی۔ شبر نیا ٹربڑاتا ہوا باورچیخانہ کے اندر داخل ہو گیا اور میں اپنی میز پر واپس آگیا۔

میں نے لکھنا پھر جاری ہی کیا تھا کہ ماما دھیا دوبارہ وارد ہوئی میں بے چین ہو گیا جی چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکل جاؤں میں نے سہمتے ہوئے بوڑھی ماما کی طرف دیکھا۔ اسکے اندر سے ایکے امن پسندی ٹپک رہی تھی۔ اس نے رازدارانہ گفتگو کی ابتدا کی۔

"بابو! ہم تو اصل بات کہے لا بھولئے گئے۔ سنو نے! آج ہم اپنا پیچ سب سکھا دے چاہے ہیں۔ یہی پیپا کا لٹ کھٹے اگر ہم بگڑم آؤ گا؟"

"تو سکھاؤ نا!" میں نے بات کو جلد ختم کرنا چاہا۔

"ہاں بابو تم ہیپیاں نہ ہو؟ یہی چھت پہ تو رے تجسر کے سامنے پیچ سب سکھے گا۔ تم کہیں جیہو نانے؟ آج اتوار ہے۔ یہی کھانہ ہم آئے رہیں تو اتنا سا بات نکل آیا۔"

"ہاں ہم یہیں پر ہیں لے آؤ اپنی چیزیں۔"

بابو جرا ٹھیک سے دیکھتے رہیو سکتا موندھی کٹا یا لڑکن کوئی ہمری پیچ سب نا

پاس سے گذرا تو ایک عام تجسّس کے جذبہ کے ماتحت اُن کا جائزہ لینے لگا ـــــ کراسن تیل کا ایک پیپا جسے قُلابہ لگا کر چھوٹے سے بکس کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک طرف پڑا سوکھ رہا تھا پاس ہی دو تین جوڑ پرانی چپلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مگر ان کا جوڑ ویسا نہیں تھا جیسا کارخانہ سے نکلتے وقت لگا تھا بلکہ بوڑھی ماما نے اُن کا جوڑ خود لگایا تھا۔ ہر چپلی اپنی طور پہ دوسرے سے بالکل مختلف تھی، کیا بہ اعتبار شکل وصورت و قد و قامت، کیا بہ لحاظِ عمر یا بہ نسبت مولد و مسکن۔ بالکل ایسا جوڑ جیسے ہندوستان میں بعض شادیاں ہوتی ہیں۔ ساٹھ اور سولہ کا فرق۔ ان بھانت بھانت چپلیوں کے پہلو میں پرانی قینچیاں ٹوٹے ہوئے زنگ آلودہ چاقو۔ ایک ٹین کے ڈبہ میں طرح طرح کے بٹن، مضمحل و فرسودہ سوئیاں، الائچیاں، لونگ ڈلیاں، قسم قسم کی کانٹیاں وغیرہ وغیرہ۔ پرانے کپڑے کے ایک بڑے ٹکڑے پر بہت سے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رنگ برنگ کے کپڑوں کے کترن اور لال نالے سے لپٹی ہوئی تھیلیاں اور بڑے چھوٹے بٹوے۔ انکے علاوہ دو تین ساریاں، کرتے، ایک دوہر، ایک پرانی اونی سوئٹر اور ایک چھوٹی گٹھری نما سی چیز۔

میں نے سب چیزوں کو چھوڑ کر اس گٹھری کو کھولنا شروع کیا۔ کئی گرہوں پر ناخن آزمائی کرنے کے بعد کامیابی نصیب ہوئی اور اندر سے ہنٹلی پامرس کے بسکٹ کا ایک بوڑھا سا ڈبہ نکلا۔ میں اس ڈبہ کو پہچانتا تھا۔ میرا جذبہ تجسّس اور بڑھا۔ کچھ بھولی بسری یاد آنے لگی۔ بیر لڑکپن میں دصیا نانی اکثر مجھے اس ڈبے کی سیر کراتی تھی۔ میرے دماغ میں دھندلے دھندلے خیالات تیر گئے۔ بوڑھی کھلائی مجھے اپنی کوٹھری میں لے جاتی تھی۔ اس کی گود میں میرے بھائی بہنوں میں سے کوئی ہوتا تھا۔ بڑی اہمیت اور کسی تقریب کی شان سے ڈبے کو کھولا جاتا تھا اور اس کے اندر

چھو چھا کریں۔ تم ڈانٹیو!"

"ہاں ہاں ضرور"!

ماما دھیا چلی گئی اور تھوڑی دیر میں اپنا پیپا اٹھا لائی۔ مجھے دکھاتی ہوئی کمرے سے ہو کر کھلی چھت پر جا نکلی اور پیپے میں سے اپنی چیزیں نکال نکال کر پھیلانے لگی۔ وہ بہت دیر تک شاید اسی کام میں منہمک رہی ہیں بھی لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ کوٹھے سے نیچے اترتے ہوئے وہ پھر میرے پاس آئی اور سرگوشی میں کہنے لگی۔

"بابو! اپنا سب چیج پسار دیا۔ ہوسیاری سے دیکھتے رہیو۔ بڑا دھوپ ہے نا تو . . . ."

"جا اطمینان سے بیٹھ نانی۔ نیچے جا کے بیٹھ!"

میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ اپنی چیزوں کی حفاظت و نگہبانی کے سلسلے میں میرے کمرے ہی میں نہ بیٹھ جائے۔ دھیا نانی نیچے جانے لگی۔ جاتے جاتے پھر لوٹ آئی۔ اور بولی۔

"سنو ہو؟ بٹوا اٹوا بھی ہے۔ اور اس میں کھاک بلائے۔ لڑکا سب اس کو چھینٹ چھانٹ نا کرے۔ چھت پر کوئی کو مت آوے دیہو!"

"ہاں ضرور! کوئی نہیں آئے گا۔"

وہ چلی گئی میں نے ٹھنڈی سانس لی اور ذرا یکسوئی سے لکھنے لگا۔ زینے پر سے آواز آئی۔

"نو رے آس پر بابو۔ ہم نہا کے پھر آدیں ہیں۔"

"ارے بھائی جا! کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اپنے اطمینان کی خاطر ماما دھیا کو تسکین دی۔

جب لکھتے لکھتے میں تھک گیا تو یوں ہی ذرا چھت پر جا نکلا۔ ماما دھیا کی چیزوں کے

کی چیزیں مجھے تفصیل کے ساتھ دکھلائی جاتی تھیں۔ نہ جانے کیوں ڈبہ کو دیکھتے ہی میرے دل میں گذری ہوئی دلچسپی پھر پیدا ہونے لگی۔ یہ ڈبہ میرے لڑکپن کا اشاریہ تھا۔ یہ سیاہ شیشم کا ڈبہ جس میں چھوٹے چھوٹے قلابے لگے ہوئے تھے۔ اس میں ایک معمولی سا تالا لگا ہوا تھا۔ میں اسے کھول کر ماضی کی دلکش یاد کو تازہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کنجی ندارد۔ مایوس ہو کر میں نے بٹووں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک مبہم سی امید بھی ناامیدی کے ساتھ دست و گریباں تھی کئی بٹووں کی دیکھ بھال کے بعد ایک بٹوے کے اندر مجھے ایک چھوٹا سا بٹوا ملا۔ اُسے ٹٹول کر دیکھا تو اس میں ایک کنجی تھی۔ بٹوے کو کھولا تو اور کئی چیزوں اور چند آنے پیسوں کے ساتھ ایک ننھی سی کنجی نکلی۔ یہ کنجی ڈبے کے تالے میں ٹھیک آئی۔ ڈبے کے کھل جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اس میں وہی سب آشنا چیزیں تھیں جن کی لڑکپن میں میری نگاہ میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس وقت بھی میں ان معمولی سی چیزوں سے دلچسپی لیتے ہوئے دراصل اپنی زندگی کے ایک حصّہ سے دلچسپی لے رہا تھا۔

ڈبے میں ایک چاندی کی ہنسلی تھی۔ چند چاندی کی بالیاں جن کے پھولوں میں میل جما ہوا تھا، ایک کانچ کا پھول دان، ایک تعویذ، چند خاکِ شفا کی ٹکیاں اور ایک بڑا سا بٹوا۔ میں نے بٹوے کو کھولا تو اس کے اندر سے کاٹھ کی ایک بہت ہی پرانی میلی سی کنگھی نکلی اور ایک چھوٹا سا بٹوا۔ اس دوسرے بٹوے کے اندر سے ایک تیسرا بٹوا نکلا۔ اور اس میں سے کانچ کی ایک لانبی سی شیشی اور ایک سرمہ کی جست والی سلائی۔ اس شیشی کے اوپر کچھ پھول سا بنا ہوا تھا۔ جیسے عطر کی شیشیوں پر بنا ہوا ہوتا ہے۔ شاید یہ اگلے وقتوں میں عطر کی شیشی ہی رہی ہو۔ مگر ایک زمانہ دراز تک اس سے سرمہ دانی کا مصرف لیا جاتا رہا تھا۔ میں نے اُسے اپنے بچپن سے یہی فرض انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا اور

اب ایک عرصہ سے غالباً اس میں سرمے کے صرف مٹے مٹے آثار ہی رہ گئے تھے۔ شیشی کی دیوار پر کچھ سیاہی سی تھی اور سیاہی کو چیرتی ہوئی بہت سی سفید لکیریں کندہ ہو گئی تھیں۔ یہ لکیریں سرمہ کی سلائی نے سالہا سال میں مختلف زاویوں سے بنائی تھیں۔ لہٰذا یہ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی نکلی تھیں، ماما دھیا ہمیشہ نہا دھو کر اپنے ڈبے کو کھولتی تھی اور اس کے اندر کے بٹوے سے یہ سرمہ دانی بڑے اہتمام سے نکالی جاتی تھی جسن کی سلائی نے شیشی میں غوطہ لگایا۔ وہ اُس کی دیوار سے ٹکرائی کھٹ کھٹ کی آواز اور ایک دو خراشیں پیدا کرتی ہوئی باہر آ گئی اور ماما دھیا کی آنکھوں میں پھر گئی یقیناً۔ اب بھی بوڑھی ماما اسی اہتمام کے ساتھ سرمہ لگاتی ہو گی اور اپنے خیال میں آنکھوں کی بینائی میں ترقی ہوتی ہوئی محسوس کرتی ہو گی۔ شیشی کی دیوار سے چمٹے ہوئے سرمہ کے موہوم سے غبار میں ایک دو خراشوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہو گا۔ مگر میں اس اہم تقریب کو اب دیکھتا نہ تھا۔ بوڑھی کھلائی کی زندگی کا راستہ میری راہِ حیات سے بہت جدا ہو چکا تھا۔ میں نے ساری چیزوں کو ایک درد آمیز احترام کے ساتھ قرینہ سے رکھدیا اور جیسے کوئی کسی تبرک کو حفاظت سے رکھتا ہو یا مندر کا پٹ بند کرتا ہو۔ میں نے ڈبہ کو بند کر دیا اور سلیقہ سے گٹھری بھی باندھ دی۔ ایک خاص روح کے پھیلاؤ اور دل کی رقت کے ساتھ میں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے ایک سایہ کو سیڑھی پر غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ کوئی دبے پاؤں زینے سے نیچے اتر گیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں واپس آ کر کام کی تکمیل میں پھر مشغول ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو گی کہ میں نے ماما دھیا کی بیتابانہ چیخ سنی۔

"ہائے ہائے! سب پھپک پھاک دہس۔ ہیجا ہو سلمنا کو! پلنگ میں مرے! ... دیکھو بابو!

دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ "میں بھی گھبرا کر اٹھا جھپٹ کر سلمتا بوڑھی ماما کی بیش قیمت چیزوں کو اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر سلمتا جلدی جلدی چیزوں کو درست کرنے لگا۔ دھیا نانی اُس کے سر پہ بوڑھی چیل کی طرح جھپٹ کر پہنچ چکی تھی اور مسلسل نو بہ نو گالیاں صلواتیں، مفرد و مرکب بددعائیں سلمتا کی گذشتہ آئندہ اور حال کی نسل و خاندان پر عذاب کی طرح نازل کر رہی تھی۔

میں دھیا نانی کی چیزوں کے پاس جا پہونچا۔ سلمتا بالکل گھبرایا ہوا تھا۔ کاٹو تو لہو نہیں بوڑھی ماما کا وہ تاریخی ڈبہ کھلا ہوا تھا۔ سلمتا شرمندگی، خوف اور شرارت میں ناکامیابی کے ملے جلے احساس کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ سرمے کی شیشی کو تھرتھراتے ہوئے وہ بٹوے میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ سرمے کی شیشی اُس کے ہاتھ سے گر کر چھن سے ٹوٹ گئی۔

"ہائے اجاڑو!" دھیا نانی نے ایک دل دوز صدا بلند کی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس پر بالکل سکتہ طاری تھا۔ اس کے لب اچانک سل گئے۔ آواز گھٹ کر رہ گئی۔ کوئی واویلا تھا نہ بددعائیں اور گالیاں تھیں نہ حرف شکایت سلمتا کے خلاف اس کا غضب سرد پڑ گیا۔ ایک طرف مجرم سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا اور ایک جانب مدعی مہر بہ لب، ساکت و صامت، بے حس و حرکت۔

مجھے سخت حیرت ہوئی کہ دھیا نانی کے یوں یک بیک بُت بن جانے کا کیا سبب ہے

میرے بہت سوال کرنے پر ماما دھیا بولی۔

"اب کا بابو! ابر تیا کے باوا ای سیسی دہن تھا۔"

دل کے انتہائی رنج واندوہ اور درد کے گہرے درد و کرب کے ساتھ یہ جملہ ادا ہوا تھا

میں اس منظر سے بہت متاثر ہوا اور بوڑھی دھیا نانی کی تالیف قلب کی بہتیری کوششیں
ہیں نے کیں میں نے ایک اچھی سی سُرمہ کی شیشی لا دینے کا وعدہ کیا اور اچھا سا سُرمہ بھی بسلمتا لگو
میں نے بے حد ڈانٹا، مارا، اُس کے اٹھک بیٹھک کرائی کان امیٹھا اور آدھ گھنٹے تک اُسے
مُرغ بننے کی فوری سزا دی۔ مگر اِن باتوں کا بوڑھی نانی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بہت دیر کے بعد وہ
اُٹھی کانچ کے ٹکڑوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرنے لگی، اور انہیں بڑی احتیاط سے بٹوے
میں رکھا۔ اُس نے چاندی کے زیوروں کو بھی نظر انداز کر دیا جب اُس نے بٹوے کو ڈبے میں
رکھ لیا تو یونہی بے دلی سے زیوروں کو اٹھا کر ڈبے میں ڈال دیا۔ یہ زیور اس کی اپنی کمائی کے بنائے
ہوئے تھے۔ پھر اور سب چیزیں پیپے میں رکھی گئیں۔ ماما دھیا پیپے کو اِس طرح اٹھا کر لے چلی
جیسے کوئی جنازہ لئے جاتا ہو۔

اِس سانحہ کے بعد بوڑھی ماما بالکل بے آزار اور قطعی گوشہ نشیں ہو گئی
چند مہینوں کے بعد ہم لوگوں نے بھی اِس کے جنازے کو اِسی طرح کندھا دیا جیسے
وہ سرمے کی ٹوٹی ہوئی شیشی کے امانت دار پیپے کو چھت پر سے اٹھا کر لے گئی تھی۔

کام

"سب سے بڑا افسانہ نویس خدا ہے"۔ اکثر یہ خیال میرے دماغ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب میں ہنگامۂ ہست و بود کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ زندگی نام ہے ایک افسانۂ مسلسل کا، واقعات و سانحات اپنی اپنی جگہ پر "مختصر افسانے" ہیں، یہ انسانی آبادیاں بدعتِ کردار کے محیر العقول کارنامے ہیں اور یہ لالہ و گل، برق و طوفان، صبح و شام، شبِ تیرہ و روزِ روشن ماحول و فضائے بعید کے رنگ برنگ سامان۔

تبسّم! ایک دلدوز انوکھا سا تبسّم، پُر درد، ملتجی، مایوس، مسترحم، آج بھی میرے افقِ تصوّر

ہیں اسی طرح برق ساماں ہے جس طرح جیٹھ کی ایک گرم شام کو سرِ راہ ہوا تھا۔ ایک ایسا تبسم
جس میں لب و دنداں کے علاوہ چشم و نگاہ بھی برابر کے شریک تھے۔

وہ ایک مزدور تھا، عمر رسیدہ مزدور۔ اس کے خزاں رسیدہ اعضا سے بھی اس کی بہارِ صحت کا پتہ چلتا تھا۔ عضلات گرچہ ڈھیلے تھے پر اب بھی اُن میں مچھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ مضبوط شانے جن پر گٹھوں کے نشانات تھے۔ استوار گردن جس میں ڈور کی طرح موٹی موٹی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ شکن آلودہ پیشانی، بھدّی بھدّی، ہتھیلیاں اور تلوے گذشتہ سخت محنت و مشقت کا افسانہ دہرا رہی تھیں۔ مگر اس کے سراپا پر ایک غم انگیز اضمحلال طاری تھا، وہ ماضی کے آباد شہروں کے کھنڈر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے گلے میں ڈور لپٹی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں ڈور کا ایک میلا، گرہ پر گرہ پڑا ہوا، ربود سا لچھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ایک موٹا سا لٹھ کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کا سارا جسم عریاں تھا، صرف کمر میں ایک میلی سی پھٹی ہوئی لنگوٹی تھی۔

جیٹھ کی تپتی ہوئی سہ پہر لو کی شعلہ فشانیوں سے نجات حاصل کر کے شام میں تبدیل ہو رہی تھی، پر اب بھی ہوا کی گرم گرم لپٹیں آ رہی تھیں، زمین تپ رہی تھی۔ اور ہنوز دھوپ پر نظریں جمتی تھیں۔ میں قصبے سے باہر آم کے باغ کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آیا۔ ڈرتا ہوا، سہما ہوا وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ تاڑتا ہوا۔ بیچارگی و محتاجی کی ایک چلتی پھرتی مورت، افسردگی و مایوسی کی زندہ تصویر۔ . . . . . . وہ میرے نزدیک آ گیا۔ آتے ہی خمیدہ ہو کر اُس نے مجھے سلام کیا۔ اور وہی اندوہناک تبسم۔ اُس کی تبسم آنکھوں سے، اُس کی مجروح روح،

اس کا ہر داغ دل جھلک رہا تھا۔ اُس کے ظاہری تبسّم کا منبع ایک المناک روحانی ابتسام تھا۔ آج تک میں نے کسی کے دل کو اتنا آشکارا نہ دیکھا تھا، کسی کی روح کو اتنے فاش طور پر عریاں نہ پایا تھا۔ وہ اس وقت "آرزوئے متشکل" تھا، "جذباتِ مجسم"، "امید و بیم" کی ایک مرئی تعبیر۔ وہ سراپا اظہار تھا۔ وہ سر بسر اپنے دلِ ریش کی تفسیر محسوس تھا۔ وہ اکھڑی ہوئی آواز میں بولا "حجور.... کام....؟" اس کے لہجے میں ایک مایوسی تھی پر اس کے اندر کام کے تلاش کی انتہائی خواہش اور کوئی کام مل جانے کی شدید تمنا پوشیدہ تھی۔ رہبودگی و ماندگی اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔... وہ پھر بولا "سرکار! بہت تکلیف ہے...... کوئی کام.... بہت تکلیف ہے ـــــ مالک...... دو تین بچہ ہے حجو..... کوئی کام.... مل جاتا..... ہے.... سرکار.... کوئی کام؟" اس کی آواز میں ایک ارتعاش تھا۔ "آئیں.... سرکار.... ہے کوئی کا.... کام"؟ اس کے بے پناہ تبسّم سے بھی یہی آواز نکل رہی تھی اور زیادہ، بہت زیادہ موثر انداز سے ـــــ وہ تھکا ہوا تھا، پاؤں ٹخنوں تک گرد سے اٹے ہوئے، پریشان سر کے بال بے ترتیب گچھوں کی صورت میں پسینے اور گرد میں چپکے ہوئے اور چہرہ اداس، پژمردہ و مضمحل تھا۔ اس شدید گرمی کے موسم میں وہ دن بھر کام تلاش کرتا رہا تھا اور ناکام۔ وہ ہمہ تن التجا تھا اور میں خاموش.... وہ مضطرب ہو کر پھر بولا "حجور! کوئی کام..... ہے؟" اس کے اندازِ تکلم میں مایوسی کا پہلو نمایاں تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا "تم کیا کرتے ہو؟" اس نے بیتابی سے جواب دیا "سرکار جو کام کا حکم ہو۔ کام مل جاتا تو پیٹ پالنے کا سہارا ہو جاتا... بچہ سب بھوکا ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا۔ ایک مہینہ ہوا ہر جگہ کھوج لگایا... آپکے پاس

ہے کوئی کام؟" وہ سراپا استفہام تھا۔ اس کی تمام کائناتِ امید صرف اسی سوال کے اثباتی جواب پر منحصر تھی۔ وہ بے چینی سے میرے قریب نہ آگیا اور پھر وہی درد آگیں درد خیز تبسم! — میں اس قصبے میں محض تبدیل آب وہوا کے لئے آیا تھا۔ اس غریب مزدور کیلئے میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔ میں نے کہا "بھائی میرے پاس کوئی کام نہیں" جیسے کسی ملزم کو فیصلے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد پھانسی کا حکم سنایا جائے، جیسے کسی پر بجلی گر پڑی ہو، غریب، بیکار، تھکا ہوا، کمزور، بھوکا، بوڑھا مزدور کمر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سر بزانو، خاموش، بے آس، وہ حسبِ معمول تمام قصبے کی خاک چھان چکا تھا۔ ہر جگہ اس کی آس ٹوٹی تھی۔ پر آہ یہ امید — سینکڑوں آرزوؤں کی مزار پر پیدا ہونے والا لالۂ بے داغ، ہزاروں ناکامیوں کے افقِ تیرہ پر چمکنے والا ننھا ستارہ — اس کے دل میں ایک آخری بار پھر پیدا ہوئی اور وہ قصبے کے باہر نکل آیا۔ تمام گرد و پیش کی رہ گردی کے بعد وہ اس باغ کی طرف امیدوار آیا تھا۔ اور یہاں قسمت نے اسے پھر ایک بار چرکا دیا — غریب، گرسنہ، ناامید مزدور!! دل تو میرا بھی دکھ رہا تھا۔ پر اس وقت میں مسافر اسے کیا کام دیتا۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں اس سے پوچھا "کیوں جی! گاؤں بھر میں تمہیں کوئی کام نہ ملا۔ یہ تو بڑا سا گاؤں ہے؟"

مزدور نے سر اٹھایا اور بولا "بابو جی! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کوئی مجھے کام نہیں دیتا۔ دو مہینے سے بیکار ہوں، پہلے لالہ جی کے یہاں باغ کا مالی تھا۔ زمانے تک ان کی خدمت کرتا رہا۔ اب سارے باغ کا کام، وہ کہتے ہیں مجھ سے نہیں نپٹتا۔ سرکار! میں تو جہاں تک ہوتا تھا، دن بھر کام پر لگا رہتا تھا۔ لالہ جی کہتے ہیں کہ ان کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ دو تین مالی اور رکھنا پڑا ان کو... ... ایک دن مجھے انہوں نے کام سے ہٹا دیا۔ اور اس دن سے مجبور بیکار ہوں۔ سب کہتے ہیں

بوڑھے سے کیا کام ہوگا۔ کوئی مجھے کام نہیں دیتا۔۔۔" یک بیک جیسے بجھتی ہوئی شمع بھڑک اُٹھے، جیسے سوکھی ہوئی پہاڑی ندی میں طوفان آجائے، بوڑھا کمزور مزدور کھڑا ہوگیا۔ اپنی لٹھ اُس نے زور سے پکڑلی اور ایک معصوم وقار کے ساتھ گویا ہوا۔ "حجور میں سب کام کرسکتا ہوں، دن دن بھر دھوپ میں کھرپی چلاسکتا ہوں۔۔۔ دوپہر کو کیاری میں پانی ٹپاسکتا ہوں۔۔۔ اور اب حجور جو کام بھی ملے کرسکتا ہوں۔ یہ ہے میری بہنگی دو من بوجھا اوٹھالونگا سرکار۔۔۔ لوگ کاہے کہتے ہیں کہ میں کام نہیں کرسکتا۔ یہی حرا جلدی نہ ہوگی۔ پھرتی نوجوانی کے ساتھ گئی۔۔۔۔ مزدور نے ایک آہِ سرد کھینچی۔۔۔" اس سے کیا سرکار؟ کام تو جرور کرلوں گا۔۔۔۔ مزدور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور طرفہ یہ کہ وہ پھر مسکرا رہا تھا۔۔۔۔ وہی قاتل تبسم! التجا آمیز، مایوس، پژمردہ، دردآگیں! میرا دل پگھلا جارہا تھا۔۔۔ میں نے جیب سے نکال کر ایک اکنّی اس کی طرف بڑھائی۔۔۔ بوڑھے بھوکے مزدور نے اُسے آرزومند مگر بے حرص نظروں سے دیکھا اور بولا "سرکار کوئی کام نہیں ہے؟ حجور مجھے کہیں کوئی کام دلوا دیجیے۔۔۔ مالک۔۔۔ کام!" میں نے کہا "بھائی میں مسافر ہوں۔ میرے پاس کوئی کام نہیں۔ اسے لے لو۔۔۔" مزدور خاموش بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اس کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ لفظ "کام" نکل رہا ہے، اس کی رُوح اس سوال کو غیر مسموع طور پر دُہرا رہی تھی۔۔۔ آہ ایک بیکار مزدور! میں نے بصد اصرار پیسے دیئے۔۔۔ اُس نے لے لئے، مگر خوشی، ندامت اور حسرت سے ملی ہوئی ایک کیفیت کے ساتھ آخر تو یہ خیرات تھی۔ مزدور کی قوّتِ بازو کا وقار بے سے کب گوارا کرتا پر وہ اور اُس کے بے کس بچے بھوکے تھے۔۔۔ اور اُسے کام نہ ملتا تھا۔۔۔ وہ اٹھا اور ایک

اندازِ منت پذیری کے ساتھ رخصت ہونے لگا۔ . . . اُس نے سلام کیا اُسی مجروح، رقت انگیز، حسرت ناک، پر اثر تبسم کے ساتھ اور چلا گیا ناکام!

اِس واقعہ کے بعد میں اُس بوڑھے مفلوک الحال مزدور سے اکثر ملا۔ دنیا نے اُسے چھوڑ دیا مگر تبسم، پُر اسرار تبسم نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ کبھی وہ کاندھے پر کدال لیے نظر آتا۔ کبھی کوئی ریوڑ ٹوکری، اور کبھی ٹوٹی پھوٹی ڈور۔ وہ جب ملتا یہی کہتا سنائی دیتا، "سرکار کوئی کام؟" وہی المناک تبسم، وہی لجاجت، وہی سوال، وہی ریوڑگی، وہی تباہی کی حد تک خاکساری، مگر ہاں زمانہ اُس بیکار مزدور میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر رہا تھا۔ اُس کی اُمیدیں مردہ ہو چکی تھیں اور اُس کا خوف بھی مر چکا تھا۔ وہ محض اضطرار اور عادت کے طور اپنا سوال دہراتا جاتا۔ . . . "کام؟" "کام . . . ؟" اُسے اس کی کوئی فکر نہ باقی رہی تھی کہ اس کا سوال مردود ہوگا یا مقبول۔ وہ اب اپنے بیم و رجا کا ایک چلتا پھرتا مزار تھا اور بس۔ اب اس کا تبسم ایک بے معنی التجا کا مظہر تھا، زار و نزار، شکستہ، موت کی حد تک مجروح، دل کی گذشتہ حسرتوں، مرحوم ارمانوں، ناکام آرزوؤں پر ایک "طنز ناکام"!! وہ اپنی بربادی کا ایک اشتہار تھا، دنیا کی بے دردی کا ایک اعلان، مزدور بوڑھا، گرسنہ، بیکار مزدور روز بروز بھیانک حد تک دبلا ہوتا جا رہا تھا، گردن پر جھریاں پڑ گئی تھیں، پسلیوں کی ہڈیاں کسی مکروہ بھوت کی انگلیاں معلوم ہوتی تھیں، جو اپنے شکنجے میں کسی بدقسمت شکار کو دبائے ہوئے ہوں۔ اُس کا پیٹ دن بدن دھنستا جا رہا تھا، کسی دھنسی ہوئی قبر کی طرح، سر چندلا ہوا جاتا تھا اور بے رونق کسی پنجر کی کھوپڑی کی مانند۔ آنکھیں حلقے میں تھیں اور تبسم کے وقت لب و دنداں اس انداز سے

کھلتے تھے، جیسے ممی کی ہوئی لاش کے لب دونداں کھلے ہوئے ہوں۔ بدقسمت مزدور کی حالت جتنی زیادہ زبوں، پُر اثر اور عبرت ناک ہوتی جاتی تھی۔ دنیا اُس سے اِسی انداز سے اور دگرداں ہو رہی تھی۔

سب سے زیادہ المناک تبدیلی جو گرسنگی، بیکاری و محتاجی کے ہاتھوں زمانے نے اُس بوڑھے مزدور کی حالت میں کی تھی۔ وہ وقار کا فقدان تھا۔ پہلے وہ خیرات لینے میں ہچکچاتا تھا اور اُسے مجبوراً قبول کرتے وقت اُس کا دل مجروح ہوتا تھا اور اب وہ ہر داد و دہش پر بھوکے کتّے کی طرح ٹوٹتا تھا۔ اور خیرات لینے کے وقت اُس کے انداز میں ضرور تمندانہ پہلو سے زیادہ حریصانہ عنوان پایا جاتا تھا۔۔۔۔۔ یہ مزدور کی روح کے پُر الم انجام کی تکمیل تھی!!

اب بھی وہ "کا۔۔۔۔۔ م!۔۔۔۔ کا۔۔۔۔۔ م" رٹتا جاتا تھا، مگر زیرِ لب بے ربط، نحیف، بے اثر لہجے میں، جیسے کسی دوسرے عالم سے کوئی بھولی بسری روح اہلِ دنیا کو ایک مبہم سا پیغام پہنچانے کی سعیٔ لاحاصل کر رہی ہو اور اب اس کے مخصوص تبسم سے ایک یاس پا، مردہ، بے حس، بے روح انفعالیت ٹپکتی تھی ؎

بے بس

رحمو، ڈاکٹر واحد کے یہاں خدمتگار تھا۔ یوں تو فرصت کے اوقات میں وہ مانگ ٹیکر شہر کی مخصوص گلیوں میں چکر لگایا کرتا، اور نا کامیاب بھی نہیں رہتا۔ مگر غریب کا ایک ارمان پورا ہوتا نظر آتا تھا۔ رحمو کی دلی آرزو تھی کہ اس کی شادی کسی خوبصورت، نیک چال چلن والی لڑکی سے ہو جائے۔ مگر اس کے طبقے کی جو لڑکیاں خوبصورت تھیں، انہیں عام طور پر لوگ، نیک چال چلن کی رہنے نہیں دیتے تھے اور جو اچھے ڈھنگ کی تھیں وہ بدشکل تھیں۔ رحموں کی عمر زیادہ ہوتی گئی اور اسی تناسب سے اس کا معیار کم ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ اُسے صرف شادی کی تمنا رہ گئی۔ وہ اب اتنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی کوئی بیوی ہو۔ اتفاقاً ایک "گنج باد آورد" قسم کی چھوکری سے رحموں کی شادی کر دی گئی۔ یہ زبردستی کی شادی تھی۔ رحمو کریمن سے نفرت کرتا تھا۔ شاید وہ اسکی

جوانی کی عام بخششوں سے واقف تھا مگر جب دھیرے دھیرے اُسے یہ پتہ چل گیا کہ پسند
کی لڑکی گویا نہیں ملتی، اور اس کا سن بھی نسبتاً زیادہ ہوگیا ہے تو وہ اپنی قسمت پر راضی ہوگیا۔
نہیں سے ہاں تو بھلا کچھ زمانہ اسی طرح گذر گیا۔ عرصہ بعد یک بیک رحمو بے قرار سا نظر آنے لگا۔
شاید پرانی حسرتیں اُس کے دل میں پھر کروٹیں لینے لگی تھیں۔ وہ اداس اداس رہتا اور گھر میں
سے روز روز لڑ پڑتا تھا۔ ہوتے ہوتے طلاق کی نوبت پہنچ گئی۔ اب رحمو پھر مفلس کا مفلس تھا۔
بیچارہ رحمو اب اِدھر اُدھر قسمت آزمائی کرتا چلتا تھا۔ اپنی برادری کی ہر معقول صورت
کنواری لڑکی کی ماں سے نیازمندانہ ملتا اور خوشامدیں کرتا۔ مگر اس کے طبقہ کی لڑکیاں چونکہ
اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے ان کی ماؤں کو ان کی شادی
کی کچھ ایسی فکر نہیں ہوتی۔ رحمو کے ارمان کیسے نکلیں۔ دن بیتتے گئے اور رحمو بن بیوی کا ہی رہا۔
اُسے بڑی فکر بھی یہی ہے کہ بڑھا جا رہا ہے۔ اور مشاہرہ بھی نہیں بڑھتا کہ کوئی روپیوں کی لالچ
ہی میں آکر اس سے شادی کرلے۔ رحموں کو ایک جیون ساتھی کی تلاش تھی، اس کا خیال تھا کہ
بغیر بیوی کے زندگی ادھوری ہے۔ بلکہ زندگی ہی نہیں ہے۔ بد قسمتی سے اس کی نظر ذرا اونچی
تھی۔ شروع جوانی میں وہ شہر کی بیسواؤں سے اپنی پیاس بجھا چکا تھا۔ اسی لیے اُسے چمک
دمک اور سندر روپ کی چاٹ سی لگ گئی تھی، بازاری عورتوں کے لاج شرم بیچنے سے بھی وہ
اکتا گیا تھا۔ اس دور کے اثر کے ماتحت بیوی کے متعلق اس کا خیال یہ بن گیا کہ بیوی روپ
رنگ کے ساتھ حیا و شرم بھی رکھے۔ مگر اس رجحان سے بڑھ کر رحمو کی فطرت کا یہ پہلو تھا کہ وہ گھر
گرہستی کی زندگی بسر کرنی چاہتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کی ایک اپنی عورت ہو جو اُسے چاہے

اُس سے پریم کرے۔ زمانہ دیکھ کر رحمو کی پسند دبتی گئی، مگر اس کی فطرت کی اصلی پیاس بڑھتی گئی پھر بھی تجربہ کی راکھ کے اندر سے پسند کی دبی ہوئی چنگاری نکل ہی پڑتی تھی۔ شاید اسی جذبہ کے ماتحت رحمو نے کریمن کو طلاق دیدی تھی۔

جب روپ پیار اور عصمت پسندی کا جذبہ پھر دھیما پڑ گیا، تو رحمو کی تمنا کا بچھلا دھارا زور دل سے بہ نکلا۔ اور وہ ایک بیوی کی چاہ میں گھلنے لگا۔ وقت کی بات ہوتی ہے، ڈاکٹر واجد کے یہاں اُن کی ایک رشتہ دار ملنے آئیں۔ اُن کے ساتھ ایک نوخیز خادمہ نوبہار تھی۔ سانولا (کھلتا) ہوا نمکین رنگ، لانبے لانبے بال، نرتشا ہوا چہرہ، آنکھیں شربتی، نکلتا ہوا قد، گداز جسم اور بیگانہ ادائیں۔ نوبہار بڑی ہنس مکھ تھی، مگر گھر یا محلہ کے کسی ملازم کو وہ آنکھ نہیں لگاتی تھی۔ وہ سب سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ جوان خدمتگار بلکہ بہت سے منچلے سفید پوش بھی نوبہار کی تاک میں تھے۔ لیکن وہ کسی کے ہتّے چڑھنے والی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ روپ رنگ، جوانی اور اس پر ان کا انمول ہونا، یہ سب باتیں رحموں کو باؤلا کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھیں۔ رحمو نوبہار کی پوجا کرنے لگا۔ وہ سوچتا کہ اگر ایسی لڑکی اس کی بیوی بن جائے تو دنیا اُس کے لئے جنت ہے۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ نوبہار کی بیوی نے خود رحمو کو اس کے لئے پسند کیا۔ رحمو کو جب یہ خبر ملی تو اس کا دل اس کے سینے سے نکلا پڑتا تھا۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ آخر کار رحمو کی شادی نوبہار سے کر دی گئی۔ وہ دوستوں سے کہتا کہ تقدیر سے فقیر کو بھی موتی مل جاتا ہے جو راجہ کو نہیں ملتا۔ وہ نوبہار کے قابل نہ تھا۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ غرض رحمو اپنے کو دنیا کا سب سے خوش نصیب شخص سمجھ رہا تھا۔

رحمو نے سارے سیر و تماشے بند کر دیئے۔ وہ پیسہ پیسہ جمع کر کے نوبہار کے لئے اچھے سے اچھا کپڑا خریدتا اور اس کے سنگار کا سامان لاتا۔ وہ اُس پجاری کی طرح تھا جو تن من دھن لٹا کر بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ نوبہار بُت بنی ہوئی تھی۔ بلکہ خود دیوی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شادی کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں، وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ وہ ابھی تک جوانی کی ایسی تھرکتی ہوئی موج تھی جو ساحل سے گلے لگ کر بھی آرزو بے پروا ہو۔ رحمو قبول صورت تھا مگر اُس کی اداؤں میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو اُسے دیوی کا دیوتا بنا سکتی، شاید مرد میں تھوڑی سی بجلی اور آندھی بھی ہونی چاہیئے۔ رحمو تو صرف سبز گھاس کی طرح تھا جو اس کے قدموں پر بچھی جاتی ہو۔

رحمو اُس مسافر کی طرح تھا جو منزل پہ پہنچکر آسودہ ہو چکا تھا، مگر نوبہار کو شاید اپنی منزل ابھی تک نہیں ملی تھی۔ اس کی جوانی کی تمنائیں ابھی تک پیاسی تھیں۔ رحمو برسا ہوا بادل تھا اور نوبہار تڑپتی ہوئی بجلی۔ نوبہار کے شباب کی ندی چڑھی ہوئی تھی۔ رحمو اس کے کنارے گنگا کے پجاری کی حیثیت سے آیا، عقیدت کے پھول لیکر، وہ ایک شناور کی حیثیت سے نہ آیا جو گنگا کو محض بازی گاہ سمجھتا ہو اور اُس ملاح کی طرح بھی نہیں جو اسے مچھلی پکڑنے کا ایک ذخیرہ جانکر اُس کی قدر کرتا ہے۔ نوبہار اب جوانی کی لذتوں سے واقف ہو گئی تھی اور وہ ان نگاہوں کے پیام کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھی جو ہر طرف سے چاہنے والوں کی بے قراریاں لیئے آتے تھے۔ مگر وہ ذرا اونچا مذاق رکھتی تھی۔ وہ سستی نہ تھی۔ وہ انمول رتن تھی۔ وہ یکتا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ وہ پسندیدہ مردوں کا شباب اور محبت خریدتی تھی اور اُس کی قیمت وہ اپنی پھلتی پھولتی جوانی

سے ادا کرتی تھی۔ رحمو نو بہار کی جوانی اور محبت صرف نکاح کے دو بول اور اپنے نیاز مندانہ تحفوں سے نہیں خرید سکا تھا۔ اس کی پریم بھگتی اور عاشقانہ فتادگی کے سبب بلکہ نکاح کی مجبوری کی وجہ سے نو بہار اسے اپنے شباب کی زکوٰۃ تو دیتی تھی اور کبھی کبھی میٹھی بولیوں کی بھیک بھی مگر رحمو نو بہار کی محبت کبھی نہ حاصل کر سکا۔

جب کوئی خواہش حد سے بڑھ جاتی ہے تو انسان اکثر فریبِ آرزو کھانے لگتا ہے رحمو کی دلی تمنا تھی کہ اس کی ایک بیوی ہو اور وہ ایک دوسرے کو دل سے پیار کریں۔ وہ اپنے ہر دے کے مندر میں ایک دیوی کو براجمان دیکھنے کی حسرت رکھتا تھا۔ یہ ارمان تو پورا ہو گیا، مگر دیوی صرف ایک مندر میں نہیں رہتی، پھر بھی رحمو کو یہ دھوکا تھا کہ نو بہار اُسے چاہتی ہے اور صرف اسی کی ہے۔ وہ اس مغالطہ میں عرصہ تک مبتلا رہا۔ وہ نو بہار جیسی بیوی پا کر اتنا مگن تھا کہ سوائے اس احساس کے اور کوئی دوسری حِس اس کے دل میں تھی ہی نہیں۔ وقت گذرتا گیا، اور نو بہار بہار بنکر بہت سی گودوں میں مچلی، مگر رحمو اُسے ایک ایسی بہار سمجھتا رہا۔ جو صرف اس کے چمن میں آئی ہو۔

کچھ عرصے بیتنے کے بعد جب نو بہار کی شوخیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو رحمو کی مالکن نے اس کی توجہ اس طرف پھیرنی چاہی، مگر رحمو پر وہ جادو چلا تھا کہ کیا کہیئے۔ وہ ان الزامات کو محض مالکن کا ظلم سمجھتا۔ "اب دو گھڑی کے لئے کوئی ہنسے بولے بھی نہیں۔ دن رات کام میں جتنا ہے میری نو بہار سے یہ لوگ جلتے ہیں۔ جلنے دو انھیں یہ ناحق کا بیر ہے۔" یہ تھے رحمو کے خیالات دوست احباب بھی رحمو سے نو بہار کی شکایت کرنے لگے۔ وہ سوچتا، ان جھوٹے یاروں سے میری قسمت دیکھی نہیں جاتی تو نو بہا نام رکھتے ہیں۔ یہ حسد کی آگ میں جھلسے جاتے ہیں۔

میری نو بہار ایک دولت ہے۔ بیش قیمت دولت ہے۔ لوگ کہتے کہتے تھک گئے اور رحمو نو بہار پر سختی تو کیا کرتا۔ اُسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کی بیوی کا چال چلن خراب بھی ہو سکتا ہے۔ نو بہار کو ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بچی اُس ڈرائیور کی ہے۔ جو اپنے صاحب کا بریچز پہنکر اکثر ڈاکٹر واجد کے یہاں آتا تھا۔ یہ ڈرائیور نہایت اچھا کباب لگاتا۔ اور صاف ستھرا رہتا تھا۔ کباب لگانے کے بہانے بارہا اُسے ڈاکٹر واجد کے دسترخوان پر کھانے اور رات کو انہیں کے گھر سونے کا موقع ملتا۔ یہ حضرت رنگیلے تھے، اور کارداں۔ نو بہار اور ڈرائیور کے تعلقات کوئی چھپا ہوا راز نہ تھا اور جو بچی پیدا ہوئی وہ بھی ڈرائیور سے حد درجہ ملتی جلتی تھی۔ مگر رحمو اس بچی کو اپنی تصویر سمجھتا رہا۔ اُس کی نظر میں بچی کی پیشانی اس کی اپنی پیشانی جیسی تھی۔ اُس کے لب کے خم بالکل اس کے لبوں کے خم جیسے تھے، اُس کی آنکھیں، اس کے کان غرض سب کچھ اس کے انہیں اعضاء سے ملتے جلتے تھے۔ باپ بننے کے بعد رحمو کے گھر گرہستی والا جذبہ اور تیز تر ہو گیا۔ اب وہ بیوی کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کرنے لگا۔ نو بہار اب اُس کی زندگی تھی۔

کچھ دنوں بعد نو بہار نے پھر وہ ہاتھ پاؤں نکالے کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ کو اُسے اپنے ایک عزیز کے یہاں دیہات بھیجدینا پڑا۔ ملازم پھر ملازم۔ حکم حاکم۔ رحمو صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا جب بھی موقعہ ملتا غریب گاؤں جاکر اپنی بیوی بچے کو دیکھ آتا۔ برہ کے دن بڑی بیقراری سے کٹتے اور جب رحمو گاؤں سے واپس آنے لگتا تو اُس کی وفا شعار آنکھوں میں آنسوؤں کی ندی امڈ آتی۔ گاؤں میں نو بہار خوب کھل کھیلی۔ بڑے زمیندار کا گھر تھا، لالہ، چپراسی، پیادے

منشی سبھی تھے۔ یہاں بھی نوبہار اپنے کو لیے دیئے رہتی تھی اور اس کا کھل کھیلنا یوں بازِ عام نہ تھا۔ نوبہار نے ہمیشہ اپنی نظر بلند رکھی بہت سے لوگوں کو نوازنے کے بعد نوبہار اپنی عنایتیں ایک نوجوان ملنشی پر صرف کرنے لگی ملنشی جی گورے رنگت کے خوبصورت جوان تھے۔ نوبہار کی وابستگی ان سے اتنی بڑھی کہ بچہ بچہ اس بات سے واقف ہوگیا ملنشی جی کے والدین کو بھی خبر ہوگئی اور وہ لوگ بہت چراغ پا ہوئے۔ کیونکہ ذلیل لونڈی انکے شریف بیٹے پر چھائی جا رہی تھی۔ گھر میں شریف بیوی موجود، مگر ملنشی جی نوبہار ہی کا کلمہ پڑھتے تھے۔ ان ساری باتوں کی خبر رحمو کو شہر میں بھی ملی۔ مگر اس نے ان افواہوں کو محض بادِ ہوائی سمجھا۔ جب رحمو نوبہار سے ملنے گاؤں آیا تو اس کے کانوں میں ہر طرف سے یہی صدا آتی کہ اس کی بیوی ملنشی کریم کی داشتہ ہے ایک ہی بات سنتے سنتے رحمو کا دل پک گیا اور وہ سب سے لڑنے بھڑنے لگا۔ ایک بار اس کی نشکو خدمتگار سے لڑائی ہوگئی نشکو نے اس کو طعنہ دیا۔

"بے شرم کہیں کا ہے نہ جورو اتیری یا جاری زنڈی"

"حیا ن سنبھال کر بول، مگچھ نکال لیں گے" رحمو نے جواب دیا۔ "آنکھ کا اندھا۔ اکل کا پورا تیری جورو تو ملنشی کی رکھتی ہے۔ سب کے آگے تو آچکی ہے۔ پتریا سے بھی بتر ہے۔ بھڑوا کہیں کا۔ اور الٹا ہم کو آنکھ دکھاتا ہے۔" نشکو رغصّہ سے بپھر کر بولا۔

"سب جھوٹ بات ہے دشمن کی لگائی اب جو کوئی اس کا نام لیگا تو ہم سے برا کوئی نہیں" رحمو نے کہا مگر رحمو کے لہجہ میں شک کا ہلکا سا رنگ تھا۔ "ہوں دھتکار" نشکو یہ کہتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

رحمو ابھی بہت دنوں تک گاؤں میں رہا اور طرح طرح کی باتیں نوبہار کے بارے میں سنتا رہا۔ نوبہار کو خود رحمو کی سعادت مندی پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منشی جی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی اور اُن کو چھیڑتی۔ رحمو چاہتا کہ ان افواہوں پر یقین نہ کرے۔ لیکن وہ روز روز ایسی باتیں سنتا کہ برداشت نہ کی جا سکتیں۔ وہ بہت چڑچڑا ہو گیا۔ وہ اس دوبدھے کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا کہ نوبہار اُس کے سوا دوسرے کی بھی ہے۔ وہ اپنے شبہات کو تھپک تھپک کر سلا دینا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں ہم جان بوجھ کر فریب کھاتے ہیں کیونکہ حقیقت تلخ ہوتی ہے۔

کانوں سنی بات کو آدمی اَن سنی بھی کر سکتا ہے، مگر آنکھوں دیکھی کو بھلا کیونکر ٹال جائے۔ وہ اکثر دیکھتا کہ اس کی بیوی منشی کریم سے گھل مل کر مزے مزے کی باتیں کرتی ہے اور کبھی کبھی مختلف بہانوں سے راتوں کو غائب بھی ہو جاتی ہے۔ رحمو چاہتا تھا کہ یہ سب محض بُرا خواب ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کرے اور جب جاگے تو حقیقت صرف یہ ہو کہ نوبہار اُس کی وفادار بیوی ہے۔ وہ سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔ لوگ اُسے غیرت دلاتے تھے لیکن جب وہ نوبہار سے تنہائی میں باتیں کرتا تو اس کے سارے شبہات کافور ہو جاتے۔ اگر کبھی وہ دبے الفاظ میں نوبہار سے یہ کہتا کہ دنیا بُری ہے، تم ذرا سنبھل کر رہو ورنہ ناحق کی جگ ہنسائی ہوگی تو نوبہار اتنا تن کر جواب دیتی کہ رحمو بھیگی بلی بن جاتا۔ کچھ روز اور گاؤں میں رہ کر وہ شہر چلا گیا۔

شہر سے رحمو نوبہار کو برابر تحفے بھیجتا رہا۔ تیل، کنگھی، آئینہ، گلدار کپڑے، اچھی ساریاں اور

نوبہاران سے اپنا سنگار کر کے منشی جی کی آغوش کی زینت بنتی رہی - نوبہار پھر امید سے
تھی - چند ہی مہینے بعد اُس کو ایک لڑکا پیدا ہوا - لڑکا پیدا ہونے کی خبر رحمو کو بھی ملی - بات صاف
تھی حساب سے لڑکا رحمو کا ہو ہی نہیں سکتا تھا - بیچارہ رحمو بے حد غمگین رہنے لگا - اب وہ اپنے کو
فریب بھی نہیں دے سکتا تھا - لوگوں نے اس کو مشورہ دیا کہ نوبہار کو چھوڑ دے لیکن یہ اس
کے بس کی بات نہ تھی - پھر یہ صلاح ہوئی کہ نوبہار کو سیدھے راستے پر لایا جائے - اس کی سزا
ہو اور سخت سزا ہو - رحمو یہ ارادہ کر کے گاؤں چلا کہ اپنی بیوی کے ساتھ سختی کرے گا اور اُسے
پارسا بنا کر رہے گا - گاؤں میں اُسے اور لوگوں نے بھی حالات بتائے اور اُسے غیرت دلائی -
ہر روز رحمو ارادہ کرتا کہ نوبہار سے دو ٹوک باتیں کرے گا اور اس کو سزا دے گا اور ہر روز
وہ نوبہار کے سامنے پہلے کی طرح نیاز مند ہی نظر آتا - لوگ اُسے زن مرید بھڑوا اور دیوث کہتے -
وہ قسمیں کھا کھا کر اپنی بیوی کو سزا دینے جاتا اور اُس کے پاس جا کر اُس کی منتیں کرنے لگتا -
نوبہار بھی رحمو کو کوڑی کا تین سمجھنے لگی - اب نوبہار خود ہی بڑھ کر یہ کہتی کہ اگر ہم بُرے ہیں تو رحمو
ہمیں چھوڑ کیوں نہیں دیتا - رحمو یہ باتیں سنتا اور پٹے ہوئے گدھے کی طرح سر نیچا کئے ہوئے
کھڑا رہتا - اس میں اتنی تاب کہاں تھی کہ نوبہار کو چھوڑ دے - وہ ایک عورت چاہتا تھا - جو
اس کی کہلائے نوبہار جیسی عورت اُسے کہاں ملتی نوبہار کو رحمو کی کچھ پروا نہ تھی اور رحمو کو نوبہار
کی بے حد پروا تھی - وہ رحمو کیلئے ناگزیر تھی -

غریب رحمو غم غلط کرنے کے لئے تاڑی پینے لگا نشہ کے عالم میں وہ نوبہار کی درستگی کی
بہت سی تجاویز مرتب کرتا اور کبھی وہ پاگلوں کی طرح بکتا اور دوسروں پر یہ الزام لگاتا کہ انہوں

نے اس کی نیک پارسا بیوی کو بُری راہ پر چلنے دیا۔ لیکن وہ نوبہار کی تادیب و اصلاح کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور نہ اُس سے علیحدگی اختیار کر سکا۔ دو سال گزر گئے اور ہر تین چار ماہ کے بعد رحمو بڑے دم خم کے ساتھ بیوی کی اصلاح کا بیڑا اٹھا کر آتا۔ اور اُس سے شکست کھا کر واپس چلا جاتا۔ منشی کریم نے نوبہار کے لئے ایک علیحدہ چھوٹا سا مکان بنا دیا۔ اور وہ اسی میں اُٹھ گئی۔ اب وہ کسی کی ملازمہ نہ تھی۔ بلکہ باضابطہ منشی جی کی داشتہ تھی۔

ایک بار رحمو شہر سے آیا اور اُس لڑکی کو جسے وہ اپنی بیٹی سمجھتا تھا نوبہار کے پاس سے چھپا کر چپ چاپ واپس شہر لے گیا۔ گویا یہ کمزور سا اعلان تھا کہ اب نوبہار اُس کی بیوی نہیں۔ جب نوبہار کو اس اغوا کی اطلاع ملی تو وہ بپھری ہوئی ناگن کی طرح رحمو کے یہاں شہر گئی۔ اور اس سے طلاق مانگی۔ رحمو نوبہار کے سامنے ایک ملازم کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اور وہ اس پر برس رہی تھی۔ پٹے ہوئے مہرے کی مانند رحمو نوبہار کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اور دور کھٹولے پر لیٹے ہوئے اس کے نونہال کو گود میں لیکر ٹہلانے لگا۔

جب نوبہار واپس گاؤں چلی تو اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی اور رحمو کے دئے ہوئے بہت سے تحفے۔

پاگل

گاؤں میں برات آئی ہوئی تھی۔ وہاں کی خاموش فضا غیر معمولی طور پر جاگ اٹھی تھی۔ ہر طرف چہل پہل، ہر سو داد و دہش۔ غرض بستی بھر میں ایک پرکیف انتشار طاری تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ اور گاؤں کے رئیس کے بنگلے پر لوگ روشنی کے سامان میں مشغول تھے۔ ضروری اور غیر ضروری طور پر یہ لوگ دوڑے پھر رہے تھے۔ چیخے جا رہے تھے۔ اور اپنی کارکردگی کا مظاہرہ بلند بانگ کیے چلاتے تھے۔ برات یہیں ٹھہری ہوئی تھی۔ بنگلے پر رونق ہی رونق تھی۔ شامیانے ٹنگے ہوئے تھے۔ دریاں اور چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کہیں پر چوکیاں بھی پڑی تھیں اور کسی جا میز کرسیاں بھی قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ برات والے شامیانے کے نیچے بیٹھے مختلف ٹولیوں میں مصروف لطف اندوزی تھے۔ گراموفون بج رہا تھا۔ تاش اور شطرنج سے ابھی ابھی لوگ فارغ ہو کر مصروف بذلہ سنجی تھے۔

کہیں پر کوئی منچلا جوان دھیمے سُروں میں کوئی غزل گا رہا تھا اور کسی رنگین مزاج بانکے کی حریص و آرزومند نگاہیں حویلی سے آنے جانے والی نوخیز چھوکریوں کی طرف اُٹھی جا رہی تھیں، بارات والے اپنی منڈلی علیحدہ جمائے ہوئے تھے منتظمین کی چیخ پکار نوبت بنوبت مجلس کی یکسانیت میں پر لطف تبدیلی پیدا کر دیتی تھی۔ دلہن والوں کے مجمع میں نوبہن ایک سپید و سُرخ رنگ، بلند پیشانی پتلی نوکیلی ناک والا نوجوان اپنی لطیفہ گوئیوں، پرلطف جملوں، موزوں شعر خوانیوں، دلچسپ پھبتیوں سے سامانِ گرمیٔ محفل بنا ہوا تھا اس کے انداز میں وہ موہ لینے والی کشش تھی کہ برات والے بھی اس طرف متوجہ ہوئے جاتے تھے۔ اہن میاں بھی ایک موزوں گوشے میں بھاری بھر کم انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چھوٹی پیشانی چھوٹے چھوٹے کچے پکے گولمرچ نمک بال، ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ دوہری ٹھوڑی بڑے کلّے جبڑے کے فربہ آدمی عربی وضع کا پاجامہ اور لانبا کرتہ پہنے کاندھے پر چارخانہ رومال ڈالے ہوئے سرِشام سے وہ اِس طرح بولے جارہے تھے کہ کسی نے ہفتہ بھر کی چابی بھردی ہو۔ ان کا موضوعِ سخن زیادہ تر اگلی پچھلی تقریبات کے متعلق تھا۔ ننھے نواب کی بڑی لڑکی کی شادی کے موقع پر سوسن بریانی پکی۔ پیر پہاڑی کے رئیس کی برات میں ہاتھیوں گھوڑوں کی تعداد، ننھو میاں کی سالی کے رخصتانہ کے وقت "شادیات کے کل لوازمات" کا انتظام خود اِن کے سر پڑجانا اور ان کا مجبوراً اس ہمّت شکن فرض کو براہِ مہربانی قبول کر لینا اور پھر اس مہم کی فتح کا سہرا ان کے سر چڑھنا وغیرہ وغیرہ۔

اس مسئلہ خاص میں ان کی واقفیت اس درجہ کامل تھی اور تواریخ شادیات پر انہیں اتنا عبور حاصل تھا کہ آپ اُن سے ناطق قاموس کا کام لے سکتے تھے۔ فلاں شادی میں زردے

ہیں زعفران کی کمی کے سبب باراتیوں کی شُسکی کی قسم کی تاریخی حقیقتوں کے علم سے لے کر چوتھی
ہیں دلہن کے موباف کے مناسب رنگ کی واقفیت تک ان کے نوک زبان تھی۔ امین میاں
کے قریب ہی ایک پست قد موٹا سا گول مول چہرے والا شخص ان کی ہر بات کو اس انداز سے
سن رہا تھا جیسے اس کی نجات اسی پر منحصر ہے اور وہ بار بار واقفکارانہ طور پر اپنا چھوٹا سا سر ہلا تا جاتا
تھا مشکور دادا (سارے بستی والے انہیں اسی نام سے یاد کرتے تھے) ایک ہاتھ میں لاٹھی لئے
ہر کس و ناکس سے مذاق اور خوش دلانہ حرکتیں کرتے پھر رہے تھے اور اپنے زعم میں کامیاب
ظرافت پر مسوڑوں تک دانت کو نمایاں کرتے ہوئے اور اپنے چوکور چہرے پر جس کے بالا ترین محاذ
کے قریب ایک میلی سی دو پلی رکھی ہوئی تھی، شکن اندر شکن پیدا کرتے ہوئے قلقاریوں پر قلقاریاں
لے رہے تھے۔ سب سے دور سائبان کے ایک نمایاں گوشے میں محترم مولوی صاحب بصد انداز
تمکنت و رعونت "شجر الزقوم" بنے بیٹھے تھے۔ پُر روغن چہرہ پر خشونت مستمرہ سے کانٹے سے بن
گئے تھے، سیاہ لانبی، الجھی ہوئی بے ترتیب سی ڈاڑھی، سر پر اعلان سیادت کے طور پر متکبرانہ
عمامہ، لانبا کرتہ، دکھلاوے کی حد تک اونچے مہری کا عجیب القطع مولویانہ پاجامہ یہ تھی۔ ان کی
وضع۔ مولوی صاحب مجلس کی خوش فعلیوں اور زندہ دلانہ مشاغل کو نظرِ حقارت و استکراہ سے دیکھ
رہے تھے اور ان کی مجموعی کیفیت سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ان کی ذات
تقدس مآب اس محفل نغمہ و سرود، اس مجلس بدعت و عصیاں میں نہ ہوتی تو پھر عذاب خداوندی
کو روکنے والی کوئی صورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ باجے بج رہے تھے، زنانخانے سے گیت کی آوازیں،
مختلف سُروں میں پے بہ پے آ رہی تھیں۔ مولوی صاحب ایسی مجلس میں ہرگاہ نہ شریک ہوتے

مگر وہ عورت طعام کو ... دکھ کر گنہگار دنیا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اور اب بھی وہ اٹھ کر اس فضائے گناہ سے چلے جاتے۔ لیکن ایسی تقریبوں میں کھانے کا وقت کم بخت بہت دیر میں آتا ہے بھلا بغیر اس فرض کو ادا کئے ہوئے قبلہ اپنی جگہ سے کیسے اٹھ جاتے۔ غرض مختلف ہیئت و وضع کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر مشغول تھے۔ رات ہو چکی تھی، گیس، بتیاں اور ڈے لائٹرز روشن کر دی گئی تھیں۔ گرمیِ محفل تیز ہو رہی تھی کہ ایک سمت سے آواز آئی۔ اونچی آواز، بھاری غصہ اور نفرت سے بھری ہوئی، بیباک، بے خوف، بے قید آواز .... "پکڑ لو، مجمع خلافِ قانون، بدمعاشو، شیطانو، تم پر کڑکتی ہوئی بجلی گر جائے ...... یہ سب مسمریزم ہے۔ غضب خدا کا برادری کی شادی اور مجھے نوید تک نہیں دیا گیا ..... تم سب لوگ گاندھی ہو، کانگریس ہو ..... ابھی وارد غریجی کو میں خبر کرتا ہوں۔ ہم گورنمنٹ ہیں ..... ہم گورنمنٹ ہیں ..... ہاں ہم گورنمنٹ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم گورنمنٹ نہیں ہیں۔ اگر یہ سچ ہے اور ہے، ضرور ہے کہ تم لوگ سوراج ہو، مسمریزم ہو اور ہم سرکار ہیں۔ سب جھوٹ ..."

مجمع کی نظریں یک بیک اس نووارد کی طرف اٹھ گئیں تفکر و تمسخر سے لبریز نظریں، استفہام و استعجاب سے بھری ہوئی نگاہیں کسی کے تیوروں میں انقباض، کسی کے انداز میں ناپسندیدگی و انتشار اور کسی کے بشرے سے شرارت آمیز مسرت ظاہر ہو رہی تھی۔ باجے والے بھی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ دولہا میاں کا چہرہ لمحہ بھر کے لئے رک گیا، مشکور دادا کی پیرانہ نابالغانہ حرکتیں بھی موقوف ہو گئیں مولوی صاحب خواہ مخواہ چہرے کے دونوں جانب سے پھول کر زیادہ مضحکہ خیز ہو گئے۔ گاؤں کے ایک قدر دار بزرگ نے نہایت متانت کے ساتھ نووارد کو مخاطب کر کے کہا "جو ادا ایسے موقعوں پر

بھی تمہارا پاگل پن نہیں چھوٹتا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نو وارد جس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں بالکل بپھر گیا۔ اس کی پیشانی اور گردن کی ابھری ہوئی رگیں اور تن گئیں اور وہ گرج کر بولا۔

"پاگل۔ ۔ ۔ ۔ تم۔ ۔ ۔ ۔ تم! ہم پاگل ہیں؟ کوئی کہہ تو دے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نہیں ہیں پاگل۔ ۔ ۔ ۔ ہم نہیں ہیں پاگل۔ ۔ ۔ ۔ ہم ہم نہیں ہیں پاگل!"

جواد بابو اپنے زمانۂ عروج میں نہایت ہوش و خرد والے شخص مانے جاتے تھے۔ وہ بستی کے رئیسِ اعظم کے دستِ راست تھے۔ ۔ ۔ لوگوں کا خیال تھا کہ رئیس دیہہ کی روز افزوں ترقی کا سبب بابو جواد اور اُن کے شریکِ کار موہن سنگھ ہیں۔ ان کی چلتی کے زمانہ میں گاؤں کا ہر فرد ان کی بے انتہا عزت و احترام کرتا تھا۔ کس کی مجال کہ ان کے قریب سے بغیر مؤدبانہ سلام کیے ہوئے گذر جائے۔ دیہاتیوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے اور باوجود لاابالی حرکتوں کے ان کی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ مذہبی خشونت اور تنگ نظری عقیدے کی حد تک ان میں بدرجۂ اتم تھی۔ مگر جہاں تک سوال اعمال و افعال کا ہے وہ یکسر آزاد واقع ہوئے تھے بلیا کھ کے زمانہ میں ان کی شوراشوری بہار پہ ہوتی تھی اور مزہ بدلنے کے لیے وہ ہر اُس چیز کا استعمال جائز سمجھتے تھے جس سے "یک گونہ بیخودی" دن رات حاصل ہو سکے بابو جواد ہمیشہ سے فضول گو واقع ہوئے تھے اور اوائل ہی سے رستہ چلتے ہوئے بھی اُنکے سر دانگشت میں فلسفیانہ جنبش ہوتی رہتی تھی۔ ایسی حالت میں وہ زیرِلب کچھ بولتے بھی جاتے تھے۔ لوگ اُسے معاملہ فہمانہ انداز اور سیاسی غور و فکر سمجھتے تھے۔ بابو جواد بہت ہوشیار مشہور تھے عقلِ معاش کا عملی ثبوت انہوں نے کافی دولت جمع کر کے دیدیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے انداز میں بے عنوانیاں

بڑھتی گئیں اور اُن کے مشاغل روز بروز احتیاط و سنجیدگی کی قیود سے آزاد ہوتے گئے۔ ان کے اندوختہ میں کمی آنے لگی۔ اور اب یہ حال تھا کہ ان کی مالی حالت اچھی نہ رہی تھی۔ انکی وہ حرکتیں جسے کبھی لوگ سعیٔ نکتہ رسی خیال کرتے تھے تھوڑے عرصہ کے بعد آثارِ جنوں سمجھی جانے لگیں۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ مستقل پاگل مشہور ہو گئے۔ مگر ابھی ایسی حالت نہیں ہوئی تھی کہ فوری گفتگو کے بعد لوگ انہیں پاگل سمجھنے لگیں۔ گاؤں والوں نے انہیں چھیڑنا شروع کر دیا۔ بیکار لونڈے ان پر پھبتیاں کسنے اور ان کے پیچھے پڑنے لگے۔ ہیجانی تحریکات کے سبب اُن کا پاگل پن بڑھنے لگا۔ بستی کا سنجیدہ طبقہ بھی گاہے گاہے ازراہِ تفریح ان سے الجھنا پسند کرتا تھا۔ بظاہر معصوم چھیڑ چھاڑ ان کی پوشیدہ مجنونانہ صلاحیتوں کیلئے تازیانہ ثابت ہوئی اور وہ پاگل پن کے سارے ساز و برگ سے آراستہ ہو گئے۔ شور و غل کے ابتدائی مرحلوں سے گذر کر اب وہ جنون کے اعلیٰ منازل طے کرنے لگے۔ جس زمانہ میں باوجود جنون کے مذکورہ دور سے گذر رہے تھے تحریکِ ترکِ موالات کا زور تھا۔ مخالف سرکار اور موافق سرکار کی تفریق ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ کے لئے انسانیت کی تقسیم کر ڈالی تھیں۔ ان کے نزدیک ایک شخص یا جماعت یا تو "گورنمنٹ" تھا یا "گاندھی"۔ کبھی وہ "سرکار" اور "کانگریس" کے الفاظ بھی برائے تفریق استعمال کرتے تھے۔ وہ راہ چلتے لوگوں سے دریافت کیا کرتے کہ "تم گورنمنٹ ہو یا گاندھی؟" اپنے کو وہ یا تو گورنمنٹ سمجھتے یا ابنِ سعود۔ تحریک ترک موالات کے معنے انکے نزدیک مسمریزم کے تھے۔ باوجود جب صحیح الدماغ تھے تو برادری کی تقریبات میں شریک ہونا ان کے لئے مذہب تھا بغیر چوک کے وہ ہر تقریب میں شرکت ضرور فرماتے تھے اور آج اس

تقریباً میں اہلِ برادری نے انہیں فراموش کر دیا تھا۔ پاگل کو کون پوچھتا ہے۔ دنیا والے سمجھتے ہیں کہ پاگل کے پاس احساس وجذبات نہیں ہوتے۔ درحالیکہ دیوانے کے احساس و جذبات شعلہائے جہنم کی طرح بھڑکتے رہتے ہیں۔ وہ ایک طوفان کی طرح اُٹھتے ہیں اور سیلاب کی مانند ہر قید وبند کو توڑ کر بیکراں ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس کے کوہ آتش فشاں حیات ایک بے پناہ زلزلے کی صورت بنیادِ عقل وخرد کو کارگہِ شیشہ گراں کی مثال مسمار کر ڈالتے ہیں۔ اگر اہلِ دنیا دیوانے کے دل وجگر کے آتشکدہ کی ایک چنگاری بھی دیکھ سکتے تو ان کے دل اسقدر برف کی مانند سرد نہ ہوتے۔

دیوانہ سرِ تقریب کھڑا ہوا تھا۔ دنیا نے اس کے ساتھ بے انصافی اور بدسلوکی کی اس کے اعصاب تن گئے تھے، بجلی کے تار کی طرح، اس کے اعضا لوہے کی سلاخوں کی صوت سخت ہو رہے تھے۔ اس کا دل تیز بہت تیز اس کی بھڑکتی ہوئی رگوں میں اُسکے جلتے ہوئے دماغ میں گرم گرم خون پہنچا رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں سخت طور سے بند تھیں۔ بے ترتیب سر کے بال ایک ہیبتناک خوابِ پریشان کے بھوتوں کی طرح تنے ہوئے تھے۔ دیوانے کا چہرہ گرم بھٹی کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ خونِ کبوتر کی مانند احمریں آنکھیں آتش چکاں تھیں۔ اس کے دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔ جیسے کوئی عفریت جانداروں کی ہڈیاں چبا رہا ہو۔ منہ سے طوفانی سمندر کی جھاگ کی مثال کف جاری تھا۔ بے پناہ نفرت کے مجنون دھارے اسکے اعصاب میں تیر رہے تھے۔ حقارت کا مہیب سمندر اس کے اعماقِ قلب میں طوفان خیز تھا اور غیض و غضب کا ایک زہرہ گداز دوزخ اس کے دماغ میں زہرناک اژدھوں کی زبان، کی طرح

شعلہ فشاں تھا۔ کسی نے اُسے پاگل کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دیوانے کی دکھتی ہوئی رگ چھڑ گیا
اتنا آسان ہے۔ جیسے لاکھوں وولٹ کے تار برق کو چھیڑ کر بجلیوں کو آزاد کر دیا گیا ہو
اس کے جذبات کی رو میں ہیجان آ گیا تھا۔ جس کے کہربائی اثرات سے مجمع پر ایک ایسی
کیفیت طاری ہو گئی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

تھوڑی دیر تک یہی سماں رہا۔ دیوانہ سب کو گھور رہا تھا۔ ابوالہول مصر کی مانند مجلس
کی مجلس کسی افسانوی سحر زدہ قلعہ کے مکینوں کی طرح اپنی مختلف حرکت و ادا کے ساتھ بت بنی
ہوئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سکوت و جمود اس وقت تک قائم و دائم رہیگا جبتک
صور قیامت نہ پھونک جائے۔ یہی عالم تھا کہ پاگل یک بیک مڑ گیا اور ایک جانب ہو کر تیز تیز
ٹہلنے لگا۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ محفل میں حرکت و زندگی کے آثار پھر سے پیدا ہو گئے۔ بہت سے لوگ
یک زبان ہو کر بول اُٹھے: "نکالو اسے یہاں سے" امین میاں نے محنت و مشقت سے سانس لیتے
ہوئے کہا۔ شادیات میں ایسی بے عنوانیاں مجھے ذرا نہیں بھاتیں ہیں اس زندگی میں سینکڑوں
تقریبات میں شریک ہوا ہوں مگر۔ ۔ ۔ ۔" اُن کا دم پھولنے لگا، پسینے کے چند قطرات پیشانی
پر نمایاں ہو گئے اور وہ بولتے بولتے رک گئے۔ شکور داد ایسے جان جھونکوں کے موقع پر یقینیا
ایک طرف سرک جاتے تھے۔ کون جانتا ہے۔ جان پر بن آئے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ پانی
پینے کے بہانے گھڑونچی کی طرف چلے گئے۔ ایک نوکیلی ڈاڑھی والے دبلے پتلے بوڑھے صاحب
جو ہر شخص کی رفتار و گفتار کے پیچھے پالیسی کو چھپا ہوا دیکھنے کے عادی تھے بڑے فیصلہ کن
انداز میں گویا ہوئے "یہ سب نقل ہے۔ پاگل پن کا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ لوگوں کا روپیہ

بچانا ہو تو پاگل بننا نہایت مفید ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں: "غریب پاگل پیش و پس انگلیوں سے اشارہ کرتا ہوا، سر ہلاتا ہوا ٹہل رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بالکل ساکن ہو گیا تھا۔ اُسکے دماغ کا باجا تبدیل شدہ قطعی تبدیل شدہ سُر پر بج رہا تھا۔ اُس کے انداز میں ایک بے خودی سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جھومنے لگا ــــــ "مدھو بنوا گئے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدھو بنوا گئے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیاں مورا مدھو بنوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب مسمریزم ۔ ۔ ۔ ۔ جو نہ کرے گاندھی نماز کے وقت دخل اندازی ۔ ۔ ۔ ۔ اب ہم دافع شرک استعمال کریں گے تو پھر مت کہیو کہ جواد پاگل ہے ۔ ۔ ۔ اگر یہ سچ ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ ہے ۔ ۔ مگر دیکھو بھائی مذہب میں دخل دو گے تو ہم ابن سعود کو بلا لیں گے۔ تین خدا کو ماننا ۔ ۔ ۔ ہیں ہیں ہیں۔ اہا ہا ہا۔ پاگل تو یہ ہے۔ ڈپٹی بھیجو چاہے کچھ۔ ہم نہیں ہیں پاگل ہم نہیں ہیں پاگل ــــ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش   من اندازِ قدت را می شناسم

دل بدست آور کہ حج اکبر است آج کرتے ہیں کس کی مجال جو دخل دے۔ ابنِ سعود بھی نہیں روک سکتا ہے۔ تم جاؤ نہ بھائی بیت المقدس ہم رو کے ہیں تم کو ۔ ۔ ۔"

سیاں مورا مدھو بنوا گئے ہو۔ مدھو بنوا گئے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک طرف سے چند چھوکروں نے ملکر "ہو! ہو!" کی صدا بلند کی۔ ۔ پاگل ایک مہیب گرج کے ساتھ ان بدتمیزوں کی طرف بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ آور ہوا۔ وہ تو پہلے سے بھاگ جانے کو تیار تھے نکل گئے۔ دیوانے کے سامنے ایک کمبیں تی پڑی۔ اُس نے اسے گھونسوں اور ٹھوکروں سے چور چور کر دیا۔ اس پر ایک سخت انتقامی جذبہ طاری تھا وہ چاہ رہا تھا کہ ان چھوکروں کو

پیس کر رکھ دے۔ اس کے دماغ میں خیال آیا کہ اہلِ محفل ہی نے ان موذیوں کو اشارہ کر دیا تھا تب ہی تو وہ لوگ ہنس رہے تھے۔

"یہ اخوان الشیاطین مجھ پر خندہ زن ہیں۔ میری ناکامیابی پر انکے دانت کھلے پڑتے ہیں۔ میں ایک ایک گیس بتی کو ایک ایک کرسی کو انکے سر پر دے ماروں گا تاکہ ان کا بھیجا نکل جائے۔ انکی کھوپڑیوں کو ہر طرف اسی طرح دانت نکالا ہوا بکھیر دوں گا۔ انکے ہنستے ہوئے سروں پر اچھلوں گا۔ دوڑوں گا، ناچونگا۔ گاؤں گا۔۔۔" یہ اور اسی قسم کے اور خیالات دیوانے کے سر میں چکر لگا رہے تھے۔ انکی آنکھوں میں ایک مافوق الفطری لرزہ خیز چمک تھی۔ اور سرد آنکھ سے شبو دیوتا کی چشم وسطیٰ کی طرح ہلاکت اور موت کی بھسم کر دینے والی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ معاً اسی وقت دو پیادوں نے پاگل کو آکر عقب کی جانب سے پکڑ لیا۔ مجمع سے پراگندہ سی مختلف آوازیں نکلیں "نکالو بدذات کو۔۔۔ ہاں ہاں مارو اسے۔۔۔۔ بند کر دو کوٹھری میں۔۔۔ پاگل، دیوانہ، پاجی۔۔۔ موذی۔۔۔ بشیطان۔ ابھی اس ناہنجار کو باہر کر دو۔ دیکھنا، زور سے اس کی مشکیں کس دو۔۔۔" ملازموں نے اور بڑھ کر اسی قسم کے طرزِ تخاطب کو استعمال کیا۔ بعض موقع شناسوں نے دیرینہ عداوت و بغض نکالنے کے اس نادر وقت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ دیوانہ فرزانوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن دور سے دیکھنے والے ہرگز یہ تمیز نہیں کر سکتے تھے کہ دیوانہ کون ہے۔ پاگل ایک آہنی عزم کے ساتھ ان ہوشمندوں کی گرفت سے نکل گیا۔ اسکی شہ زوری کے آگے ہر شخص طفلِ نوخیز معلوم ہو رہا تھا۔ لوگوں نے اسے دوبارہ گرفتار کیا اور وہ دوسری بار بھی سب کو جھاڑ کر اس طرح علیحدہ جا کودا جیسے یہ سب گیر و دار محض بازیچۂ اطفال تھا۔ دیوانہ ایک ریگستانی بگولہ معلوم ہو رہا تھا، ایک متحیر افگن طوفان، ایک زہرناک سموم۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے اور ربود ہوئے

جا رہے تھے۔ وحشیاں اس طرح زبان نکالے ہوئے تھیں۔ جیسے صحرائی اژدہے اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے زبان نکال لیتے ہیں۔ وہ چیخ رہا تھا پیہم دیوانہ وار بپھرے ہوئے شیر کی طرح ''ہلاکت آفریں'' ''سائیکلون'' کی مانند وہ رقص کناں تھا۔ ان شیاطین کی طرح جو اپنے شکار کو شعلوں کے سپرد کر کے اس کے گرد رقص کرتے ہیں ہر جانب مخاصمین گر رہے تھے شاخہائے نازک کی مثال، بنیاد سے اکھڑے ہوئے درختوں کی طرح کرسیاں، میزیں، لیمپ، آبخورے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے جاتے تھے۔ دیوانے کے سر سے خون جاری ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی لہولہان ہو رہے تھے مگر وہ غیرِ مفتوح تھا۔ پاگل کا عزم و ارادہ بے پناہ ہوتا ہے۔ ناقابلِ شکست آہنیں، کوہِ وقار۔ کوئی اس پر فتح نہیں پا سکتا، کوئی اسے تسخیر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کسی امر پہ تُل جائے تو اہلِ خرد کا عزم اس کے آگے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔ دیوانے نے جست لگائی اور دُور جا کھڑا ہوا۔ نفرت کی ہنسی ہنستا ہوا اور حقارت کی نگاہیں ڈالتا ہوا۔ نفرت و حقارت کے ساتھ فتح و ظفر کی ایک ایسی مسرت بھی اس کے انداز میں نمایاں تھی جو ایک مجنون کو ہو سکتی ہے۔ اس نے دوسری جست لگائی اور نظروں سے غائب تھا۔ مجمع پر ایک انفعالی غیض و غضب کی کیفیت طاری تھی پس پا، شکست خوردہ، مضمحل، امین میاں توند کے پیچھے سے ہانپتے ہوئے نیم بیہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ شکور دادا کو پانی پینے میں مصلحتاً غیرِ معمولی دیر ہو رہی تھی اور ذہین جو سارے واقعات کو اب تک خاموشی سے دیکھ رہا تھا سوچنے لگا کہ ایک دیوانے کے سامنے دوسرے لوگ بھی کیوں پاگل سے ہو جاتے ہیں۔ ان کے مفروضہ ادعائے اخلاقیات کو کیا ہو جاتا ہے۔ ذہین گو ظاہراً خوش باش نوجوان تھا مگر باطنی طور پر بہت ہی ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ دنیا والوں کے اخلاق و تہذیب یکسر دکھاوا ہوتے ہیں۔ سراسر فریب، تارِ عنکبوت کی طرح ناپائدار۔ اخلاق و مراسم کے

نازک رنگین شیشے میں بداخلاقیوں کے کالے ناگ رہتے ہیں جس طرح چیتے کے نرم و نفیس پنجے کے غلاف میں خونریز ناخن پوشیدہ ہوں۔ یہ ظاہر داری کے چیلنے پھرتے پیکر خود غرضی و خود نمائی کیلئے اخلاق کو روا کہتے ہیں۔ ان کے ملنے جلنے میں صداقت نہیں ان کے سلام و کلام میں خلوص نہیں جب ہی تو ایک ایسے شخص کے لئے جو تباہ حال ہو برباد ہو مفلس ہو مجبور ہو مختل الحواس ہو انکے اخلاق بر روئے کار نہیں آتے۔ بلکہ اس سے بھی بڑا یہ کہ قابلِ رحم ہستیوں کو خداوندانِ تہذیب و شائستگی سامانِ تفریح بنا ڈالنے میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے

ذہین انھیں خیالات میں محو تھا۔ کہ ایک خشونت سے بھری ہوئی آواز سمع خراش ہوئی۔ "یہ سارے واقعات بابداہت جواد کے افعال شنیعہ کے نتائج قبیحہ ہیں۔"

یہ تھے قبلہ مولوی صاحب اجارہ دار مذہب و اخلاق۔ دور سے ایک بے ربط سے نغمے کی آواز آئی۔ پاگل گلیوں میں گاتا جا رہا تھا۔۔۔

"کون بن کو کت کو نیا ہو رہا . . . . !

کون بن!"

جینے کا سہارا

اسے ہر راہگیر جانتا تھا۔ شام سویرے وہ بانکی پور پٹنہ کی سڑکوں پر یا گلیوں میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آجاتی تھی۔ وہ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بیٹھی بیٹھی گھسک کر چلتی تھی اکڑو بیٹھی ہوئی وہ دائیں بائیں ملتی جاتی تھی۔ کلاک کے پنڈولم کی طرح وہ ملتی جاتی تھی۔ اور اس طرح ناقابلِ محسوس طور پر آگے بڑھتی رہتی تھی۔ ایسی اکتا دینے والی جنبش کے ذریعہ وہ گلیوں اور سڑکوں کی خاک چھان لیتی تھی۔ راہی اسے دیکھتے ہوتے یا نظر انداز کرتے ہوئے گذر جاتے تھے، بچے، بگھیاں، فٹن، رکشے اور بیل گاڑیاں اس کے پہلو سے گزرتی رہتی تھیں اور وہ گھڑی کی سوئی کی طرح عمرِ رواں کی مثال آہستہ مگر یقینی طور پر آگے بڑھتی جاتی تھی کچھ زیرِ لب گاتی ہوئی، ناقابلِ فہم انداز میں گنگناتی ہوئی۔ کون جانے وہ کیا گاتی تھی۔ دکھ کے گیت یا مٹے ہوئے سکھ کا راگ۔

وہ سڑک یا گلی کے کنارے کھسکتی جاتی تھی اور اُس کے پہلو میں نالے کا پانی، خس و خاشاک ملبے اینٹ روڑے سے اٹکتا، سرسراتا ہوا، بہتا جاتا تھا، اسی بوڑھی، تباہ حال زمانے کی ٹھکرائی ہوئی فقیرن کی زندگی کی طرح۔

مجہول، اپاہج، بوڑھی فقیرن شاید اندھی تو نہ تھی۔ مگر میں اُس کی آنکھیں کبھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے، اور پپنیاں ایک دوسرے سے اُلجھی رہتی تھیں۔ وہ ہماری سماج کی طرح اندھی تھی۔ آنکھ رکھ کر اندھی، بیمار، بیکار آنکھیں، اُس کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے اور اُس کے پاؤں میں جھنبھڑے لپٹے رہتے تھے۔ اس کا لباس صرف ریودھی نہ رہتا تھا بلکہ اکثر وہ آدھی ننگی ہی ہوتی تھی، نہیں ننگی سے بڑھ کر ننگی، کیونکہ بدحالی میں بیشتر اس کے جسم کے وہ حصّے عریاں رہتے تھے جنہیں مستور ہونا چاہیے اور وہ حصّے بُرے بھلے چھپے رہتے تھے۔ جن کے پوشیدہ رہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

وہ کسی سے بھیک نہیں مانگتی تھی۔ بلکہ اپنے حال میں گرفتار گٹھری بنی ہوئی ہلتی جلتی، گنگناتی آہستہ، بہت آہستہ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ دن بھر میں وہ گلیوں اور بھرے بازار کا سفر کر لیتی تھی۔ اسے بہت کم بھیک ملتی تھی۔ فقیرن کے حال کی یکسانی ایسی روزانہ کی بات ہوگئی تھی کہ لوگوں کی توجہ بھی اس طرف نہیں پھرتی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں سوچتا کہ اس کی زندگی میں کیا کشش ہے۔ کہ وہ جیے جاتی ہے۔ اس کے جینے کا کیا سہارا ہے، میری سمجھ میں نہ آتا، بے مقصد زندگی زندگی نہیں، زندگی کی تہمت ہے، فقیرن کی زندگی بے کیف، بے اسرار، دکھی، پھیکی اور سپاٹ ہی نہ تھی بلکہ دکھ درد اور روگ سے بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ جیے جاتی تھی، وہ زندہ رہنے کی کوشش کرتی تھی۔

اس کی زندگی میں حرکت پیہم تھی۔ استقلال تھا۔ شاید جینا خود ایک مقصد ہے۔

بوڑھی فقیرن سبزی باغ میں گوبی کی ڈنٹھل، کرم کلّے کے پتّے، سڑے ہوئے شلجم، کچلے ہوئے ولایتی بیگن اور داغدار آلو سڑک پر سے جمع کر لیتی تھی اور پھر اسی جنبش پیہم کے ساتھ اپنی راہ لگتی تھی۔ عدالت کے ہوٹلوں کے سامنے وہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹیوں کے کنارے چن لیتی تھی۔ بھوکے بازاری کتّے اُس سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ اُس پر بھونکتے نہ تھے۔ شاید وہ فقیرن کو اپنا جائز حصّہ دار سمجھتے تھے۔ مگر کوئی نیا آوارہ کتّا جو اُدھر آنکلتا تو فقیرن کا ہاتھ ضرور اُس کے پنجوں سے مجروح ہو جاتا اور لباس زیادہ تار تار ـــــــ

یہ اپاہج بھکارن سر راہ کسی مہترانی یا کسی بوڑھے مزدور کو کبھی کبھار اپنی جیون کہانی سناتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ نے بھی ایک بار وہ کہانی سنی ہے۔ کہانی بہت ہی مختصر ہے ـــــ

وہ ایک بوڑھے فقیر کی بیٹی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ اسی شہر میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ دن بھیک مانگتے گذر جاتے اور راتیں کلکٹری کچہری کے برآمدے یا کسی پیپل کے درخت تلے بسر ہو جاتیں۔ پہرہ دار انہیں بہت ستاتے تھے۔ گرمی کی راتیں تو کھلے میدان میں گذاری جا سکتی ہیں، مگر برسات اور جاڑے کی راتیں بڑی بیرن ہوتی ہیں۔ انہیں دشمن راتوں کو کاٹنے کے لئے کسی پناہ کی جگہ کی ضرورت ہوتی۔ پہرہ دار دل کو کچھ دے دلا کر ایسی جائے امن میسّر آجاتی تھی۔ وہ اب جوان ہو چلی تھی اور زندگی کے دکھوں کو زیادہ محسوس کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ جوانی کے سنہرے خواب دیکھتی اور ترس ترس کر رہ جاتی

کچھ دنوں سے ایک نوجوان پہریدار اُس پر بہت مہربان تھا۔ وہ بغیر پیسے لئے انہیں کچہری کے برآمدے میں سونے کی اجازت دیدیتا تھا۔ اور گاہے گاہے رات گئے ان کے پاس آبیٹھتا تھا وہ انہیں اپنی دلاوری اور جیالے پن کے قصے سناتا تھا۔ چوروں کو پکڑنے کے قصے، ڈکیتوں کو گرفتار کرنے کے واقعات بلووں میں گولیاں چلانے کے واردات۔ فقیرن پہرہ دار سے مانوس ہوتی جاتی تھی اور جب کبھی وہ پہرہ کی تبدیلی کے سبب نہ آتا تو وہ اداس رہتی اور اسکی راتیں بڑی بے چین کٹتیں۔ بھری برسات کی ایک سسکتی ہوئی ظالم رات کو فقیرن کی جوانی کا سہانا خواب حقیقتِ عریاں بن گیا۔ وہ دن بڑے مزے میں کٹ رہے تھے۔ چند مہینوں کے بعد پہرہ دار کہیں چلا گیا اور فقیرن اس کا انتظار کرتی کرتی تھک کر بے آس ہوگئی۔ اب وہ ماں بننے والی تھی۔ مگر ان فکر و مسرت کے دو رسے دنوں میں کوئی اس کی دل دہی کرنے والا نہ تھا۔ ہونیوالی بات اب کے جو دوسرا پہرہ دار آیا تو اُس نے جاڑے کے ٹھٹھرے ہوئے ایام میں فقیرن اور اسکے بوڑھے باپ کو کچہری کے برآمدے سے نکال دیا۔ بے آسرا ہو کر وہ لوگ درخت کے نیچے رین بسیرا کرنے لگے۔ کیسا پاپی تھا۔ پہرہ دار۔ فقیرن کو اپنا "دیالو" پہرہ دار یاد آجاتا۔ مگر وہ بھی تو "نرموہی" نکلا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ فقیرن کے باپ کو نمونیہ ہو گیا اور وہ چل بسا۔ اس بے تھاہ جگ میں اس اندھی نگری میں اُسے تنہا چھوڑ کر وہ رخصت ہو گیا۔ نکلتے جاڑے میں فقیرن کو ست ماسہ بچہ پیدا ہوا۔ اسی درخت کے نیچے جہاں وہ رہتی تھی۔ تیسرے روز بچہ مر گیا اور ہفتہ کے اندر اندر فقیرن کو کمر سے نیچے فالج آگیا۔ اُسی روز سے وہ نگوڑی "پنا نگر" ہوگئی۔ اور اب اس کا یہ حال تھا۔

اپنا دکھڑا سنا کر فقیرن رونے لگتی تھی، اُس کے آنسو ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح دھول میں گر کر رائیگاں ہو جاتے تھے قصہ سننے والے محض بے معنی ہمدردی سے فقیرن کو دیکھتے ہوئے گذر جاتے اور وہ پھر شکستہ امید کی طرح کانپتی ہوئی رہ نوردی کے لئے آگے بڑھنے کی ایک ناتوان سی کوشش کرتی۔

میں اُس فقیرن کو روزانہ دیکھتا تھا اور میرے دل میں ایک مبہم سا جذبہ جستجو پیدا ہوتا تھا کہ وہ اِن دنوں کہاں رہتی ہے اور کیونکر۔ ایک شام کو میں بھنور پور گھر جا رہا تھا کہ میں نے اُس مفلوج بھکارن کو سبزی باغ سے لوٹتے ہوئے دیکھا۔ شام کی تاریکی گہری ہو کر رات بننے والی تھی۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ اب اپنی قیام گاہ کو واپس جا رہی ہے۔ میں وحید خلیفہ کی دوکان پر ٹھہر گیا تاکہ بھکارن آگے بڑھ لے۔ مجھے بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ میں دکان سے اٹھا اور آگے بڑھکر میں نے دیکھا کہ مجبور بڑھیا ابھی تک صرف ایک موڑ طے کر سکی ہے، وہ کچھوے سے بھی آہستہ کھسک رہی تھی، انتظار کی گھڑیوں کی طرح آہستہ۔ میں اگلی موڑ پر ایک دواخانہ میں چلا گیا اور بہت دیر تک دوا فروش سے بے تکی باتیں کرتا رہا، میں نے دواؤں کی قیمتیں دریافت کیں، انکے فوائد سے بحث کی، انگریزی اور ہندوستانی دواؤں کا مقابلہ و موازنہ کیا اور سارے شہر کے طبیبوں پر تبصرہ کر ڈالا اور آخر کار سیاستِ حاضرہ پر لوگوں سے الجھ پڑا تاکہ وقت کٹے۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج میں بھکارن کے سر چھپانے کی جگہ کو ضرور دیکھوں گا۔ جب میں دواخانہ سے نکلا تو سامنے کی سڑک پر دوسری موڑ تک بڑھیا نہ تھی۔ میں موڑ تک گیا بھنور پور گھر والی سڑک پر بھی فقیرن نہ تھی میں حیران حیران اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک پلّے کے بھونکنے کی آواز نے میری توجہ اُسطرف

منعطف کرائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مجبور و معذور بھکارن ایک کھپریل میں، جو ایک مکان کی پشت سے لگا ہوا تھا، داخل ہو رہی ہے اور اُسے دیکھ کر ایک کتے کا چھوٹا سا پلّہ دُم ہلا ہلا کر دھیمے دھیمے بھونک رہا ہے۔ پلّہ کھونٹی سے کھپریل میں بندھا ہوا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل موڑ کے پاس پرنالے والی گلی میں شکستہ بانسوں پر پڑی ہوئی تھی۔ چاروں طرف کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا اور پرنالے کا پانی رُک رُک کر بہہ رہا تھا۔ دو طرفہ مکانوں کی موریاں اسی گلی میں آ کر گرتی تھیں بھکارن کھپریل میں داخل ہوئی پلّے کے پاس پہنچی اور اپنی ساری کے آنچل سے بندھی ہوئی ہڈیاں اس کے سامنے کھولدیں۔ پلّہ غراتا ہوا بڑھیا کے آنچل سے ہڈیاں کھاتا رہا۔ فقیرن نے دوسری پوٹری سے روٹیوں کے کنارے نکال کر پلّے کو دئے اور خود اُس سے پیار کی باتیں بولتی رہی میں کھڑا ہوا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ جب بھکارن پلّے کو کھلا چکی تو اُس نے خود کچھ روٹی کے کنارے کھائے اور اس کے بعد پلّے کو کھونٹی سے کھول کر گود میں لے لیا اور بچھی ہوئی پیال پہ جا کر اُسے پہلو میں لئے لیٹ گئی۔ بھکارن کچھ لوریاں سی گاتی جا رہی تھی۔ اور پلّہ آغوش کی گرمی کے مزے لیتا ہوا غوں غوں کر رہا تھا۔

میں یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ شاید یہ پلّہ ہی بے آسرا بھکارن کے جینے کا سہارا ہے۔

تسکینِ حسرت

گاؤں کے اکثر کھیتوں سے ربیع کی فصل کٹ چکنے کے بعد ٹال کی سیاہ کوال مٹی بہت ہی نمایاں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک یہاں وہاں گیہوں اور بونٹ کے سنہرے کھیت شام کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پچھوائی چل رہی تھی جس کی لہروں میں گیہوں کے خوشے اور بونٹ کی چھوٹی اور گدازڈھیریاں جھول رہی تھیں۔ ہواہیں ہنوز گرمی تھی۔ گاؤں کے قریب، بھبھڑ کی قسم کے کھیتوں میں ترکاریوں کی لیتّن اور پودے اپنی ہریادل سے دل نظر کو فرحت و تسکین بخش رہے تھے۔ ان سبز و شاداب کھیتوں کے درمیان کنوؤں پر لاٹھے لگے ہوئے تھے۔ جو اکثر میل رہے تھے اور ان کے چلنے سے مسلسل 'چول چول' کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ دہقان کھیتوں

کو پیار ہے بھٹے بنگھٹ اور پگڈنڈیوں پر عورتیں اور البیلی لڑکیاں پانی بھرتے یا گھڑوں اور کلسیوں کو سنبھالتے نظر آرہی تھیں۔ ان کی سُرخ اور زرد ساریاں، جن پر گذشتہ ہولی کے رنگوں کی گلکاریاں چیت کے شباب کی رنگ رلیوں کی خوشگوار یاد دلا رہی تھیں، بہت ہی دلفریب تھیں۔ اِن کی چہلیں اور شرمیلی ہنسی اِس سارے منظر کی روحِ رواں تھی۔ میدانوں میں لڑکے اور نوجوان کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور گلیوں میں بھی گولیاں کھیلی جا رہی تھیں۔ گاؤں کی فضا پُر مسرت اور طمانیت چھائی ہوئی تھی۔

چودہ سال کا چھوکرا شبرتیا گاؤں کے زمیندار کے چھوٹے بچے کو گود میں لئے بنگلے کے چبوترے پر خیالات میں گم ٹہل رہا تھا۔ وہ لڑکا کھلانے اور اوپر کا کام کرنے پر ملازم تھا۔ وہ سوچنے لگا "بلا سے ہم ہی تو ایک نہیں۔ رحمو ا اور دھوا کر بھی نور حمت بابو اور فرید بابو کے یہاں کے کام سے چھٹی نہیں ملتی ——— اور عبید وا" عبیدوا کا نام ذہن میں آتے ہی شبرتیا آپ ہی آپ مسکرایا "منجھلی دلہن سے کیسی جوتیاں کھاتا ہے وہ۔" اُسے تسکین سی ہوئی جیسے اُن جوتیوں کی مار سے وہ خود بچ نکلا ہو۔" مگر للّو ساؤ بنیا کا لڑکا اور رموتور سونار کا چھوکرا، شرفو بابو، بھولا بابو، غنیا . . . ." اپنے ہم عمر بہت سے لڑکوں کے نام اُس کے خیال میں آتے۔ یہ لڑکے زمینداروں تاجروں اور فارغ البال کسانوں کے تھے۔ شبرتیا کے چہرے پر مایوسی اور حسرت کے آثار پیدا ہو گئے۔ زمیندار کا لڑکا اُس کی گود سے پھسلا جا رہا تھا۔ اُس نے لڑکے کو سنبھالا اور ٹہلنے لگا۔

کلکتہ سے صغیروا کل ہی آیا ہے۔ اُس کا باپ لوٹ پر کماتا ہے اور صغیروا بھی بیڑی

بنا کر خوب پیسے کما لیتا ہے۔" شبرتیا کی آنکھیں یک بیک چمک اُٹھیں اور پھر بجھ سی گئیں۔ اُس کی چشمِ تصوّر نے صغیروا کی رنگ برنگی لنگی دیکھی اور جاپانی ربڑ کا پمپ شو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُس خوبصورت لنگی کو خود پہنے ہوئے ہے اور وہی ربڑ کا جوتا اُس کے پاؤں کو گدگدا رہا ہے لیکن یہ فریبِ رنگیں بہت جلد حقیقت کی بے رنگی کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

"ہم بھی کلکتہ کیوں نہ بھاگ جائیں اور پھر رنگ برنگی لنگیاں، پمپ شو اور سب سے بڑھکر آزادی۔ ہر کام سے آزادی۔" اُس نے اپنے طور پر کلکتہ کے وسیع شہر کا تصوّر کیا۔ پھر اُسے وہ قصّے یاد آنے لگے جو صغیروا اور دوسرے کلکتے سے آنے والے بیان کرتے ہیں۔ اُس کا جی چاہا کہ لڑکے کو پٹک کر بھاگ نکلے اور جبار میاں کی دکان پر جا کر کلکتے کے قصّے سنے۔ اس ایک لمحے میں شبرتیا کے لئے زندگی کا مقصد صرف کلکتہ کے قصّے سننا تھا۔ "ٹریم گاڑی، جادو گھر، چڑیا خانہ، ہوٹل، بائیسکوپ . . . . . . بیڑی کی دکان، پیسے، رنگین لنگیاں اور پمپ شو" ان کے متعلق اُس نے جانے کیا کیا تصوّر قائم کیا۔

زمیندار کا بنگلہ گاؤں کے کنارے ایک اونچی جگہ پر واقع تھا۔ شبرتیا نے پہلو کے میدان میں گاؤں کے لڑکوں کو کبڈی کھیلتے دیکھا اور دُور چند لڑکے پہاڑی کے کنارے والے آم کے باغ کی سمت میں جا رہے تھے۔ اُس نے حسرت بھری نظر سے اُن لڑکوں کو دیکھا اور گود سے پھسلتے ہوئے بچّے کو غصّے سے جھٹک کر کمر کے اوپر سنبھال لیا۔ سامنے کھیت میں کھیرے پھلے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ رات کو کھیروں پر شبخون مارے۔ اُسے پھر آم کے ٹکولے[1] کا خیال آیا اور اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

[1] کیریوں کو بہار میں "ٹکولے" کہتے ہیں

"شبر تیا، شبر تیا رے!" ——— شبر تیا چونکا ہو کر بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے سمجھا کہ کسی اور سخت بدمزہ کام کے لئے اُسے بلایا جا رہا ہے۔ پھر آواز آئی "شبر تیا! ابے شبر تیا! کبڈی نہیں کھیلے گا؟ آ، نہ رے شبر تیا!" رضیا اور غنیا میدان سے شبر تیا کو آواز دے رہے تھے۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ذرا آگے بڑھ کر وہ جواباً چلایا۔ "کیسے آویں ہم رہے۔ ہم کو لالٹین صاف کرنا اور پانی بھرنا ہے" اُس کی آواز گلوگیر تھی۔ لڑکے کبڈی کھیلنے لگے۔

"کبڈّی کبڈّی کبڈّی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبڈّی! کبڈیہہ! کبڈیہہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چل کبڈیّی تارا۔ سلطان گنج مارا، سلطان گنج مارا ۔ ۔ ۔" کیسی دلفریب آواز دی۔ بول کا ترنّم شبر تیا کو بیقرار کئے دیتا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بصد حسرت تماشہ دیکھتا رہا اور پھر ایک خشمگیں مایوسی کے ساتھ حویلی کی طرف چلدیا۔

" ابے او شبر تیا! مر گیا کمبخت! ہر وقت کھیل، ہر وقت تماشہ! بس بچہ کو گود میں لے لیا، سارے کام دھندے سے فراغت، نظارہ بازی کو نکل کھڑے ہوئے۔ کام چور، نمک حرام! ——— غارتی! مردار! ——— سارے کام پڑے ہوئے ہیں اور حضور سیر سپاٹے کر رہے ہونگے ۔ ۔ ۔ ۔" یہ الفاظ بڑی بیگم کے تھے جو شبر تیا نے حویلی میں داخل ہوتے ہوئے سنے۔ اس کا جی جل گیا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا غریب۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش اس کے دل میں بغاوت کی کمزور سی لہر اُٹھی اور بے بسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر غائب ہو گئی۔

بڑی بیگم اُسے دیکھ کر بے حد چراغ پا ہوئیں۔ اور انہوں نے اسے مسلسل نہایت ہی شگفتہ صلواتیں سنائیں۔ جھڑکیاں سہتا ہوا شبر تیا اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ کنوئیں سے پانی لانا، جھاڑو دینا، لالٹین صاف کرنا وغیرہ وغیرہ۔ "اوپر کے کام" کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو آدھی رات تک قائم رہا۔

"کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈی . . ."

"ابے پاگل تو نہیں ہو گیا" مونڈی کاٹے، دن چڑھے تک سویا ہوا ہے" گھر کی بوڑھی ماما نے سوئے ہوئے شبر تیا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"ـــــ چل کبڈی تارا سلطان گنج مارا سلطان گنج . . ."

بوڑھی ماما نے شبر تیا کے ایک دو ہنٹر دیا۔ وہ چونک کر گھبرایا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہی "اوپر کے کام" کا غیر فانی سلسلہ۔

بوڑھی ماما بڑبڑاتی، کوستی باورچی خانے کو چل دی۔ وہ دو روٹیوں کی آس لگائے ہوئے تھی۔ بوڑھوں کی زندگی کا اہم ترین مقصد صرف کھانا ہے۔

شبر تیا ایک ہاتھ میں جھاڑو لئے اور دوسرے سے آنکھیں ملتا جھکا ہوا ایک کمرے میں جھاڑو دے رہا تھا۔ اُسے بوڑھی ماما کا دو ہنٹر اور بڑی بیگم کی صلواتیں یاد آ رہی تھیں۔ اُس کی گرد آلود پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "یہ بڑھیا ہم کو مارنے والی کون ہوتی ہے اس کتیا کا چڑا چڑا کر ناک میں دم نہ کر دیا تو میرا نام شبر تیا نہیں۔ ارے یہ بڑی بیگم کے برتے پر ہم کو آنکھیں

دکھاتی ہے نا۔" بڑی بیگم کا خیال آتے ہی شبر نیا کو بڑی بیگم کے سارے مظالم اور اپنی ساری حسرتیں یاد آگئیں۔ اس کے چہرے پر خون کی پچکاری سی پڑ گئی۔ "نمک حرام اور کام چور۔ اور اوپر سے جوتیاں ہم اب کبھی نہیں رہیں گے ان کے یہاں میری عمر کے لڑکے تو طرح طرح کے کھیل کھیلیں، کبڈی، ٹھو گلی ڈنڈا، تیر نا اور ہم اُن کے گھر سڑا کریں۔ آدمی نہ ہوئے بیل ہوئے۔ جیسے ہم بے جان ہیں۔ بیل سے بھی بدتر۔"

شبر نیا کا جی چاہتا تھا کہ ابھی فوراً بھاگ نکلے لیکن یک بیک اُسے اپنے ماں باپ کی غربت یاد آگئی۔ وہ بھاگ کر کہاں جائے۔ کلکتہ؟ اتنی دور پیدل جانا ناممکن اور پاس کوڑی بھی نہیں کہ ریل پر بیٹھ کر جائے۔ ریل پر بیٹھنے کے خیال سے اس کا دل ایک مبہم سے سرور کے احساس سے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کہ اُس کے ماں باپ غریب کیوں ہیں۔ پھر اُسے دوسرے غریب لوگ یاد آئے اور اس کے بعد امیر لوگ اور آخر میں بڑی بیگم۔ بڑی بیگم ہی سے اُسے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ شبر نیا جھاڑو دیتے دیتے بیٹھ گیا۔ خیالات و تصورات کی شدت مانع حرکت و عمل ہوتی ہے۔ اُس کے دل میں الجھاوا سا تھا۔ وہ کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔ صاف اور واضح طور پر۔

"... آخر ہم رحموا، دھوا، اور عیدوا کیوں آزادی سے کھیل کود نہیں سکتے۔ کیا اس لئے کہ ہمارے ماں باپ غریب ہیں۔ ہاں شاید اسی لئے۔ ٹھیک۔ تب ہی تو بھولا بابو، شرفو بابو ننکو جی، اکرن ساؤ تے جی، خوب آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ مگر جلبو اور سلمتا، یہ تو ہم جیسے غریب ماں باپ کے بیٹے ہیں یہ کیوں آزاد ہیں؟" شبر نیا کو گذشتہ دوپہر کا وہ منظر یاد آگیا جب

حلیمو اور سلمتا لالہ کاشی لعل کی گھوڑی پکڑ کر نواری کی رسی کا لگام لگائے اُس کی کھلی پیٹھ پر سوار کھیتوں اور باغوں میں دندناتے پھرتے تھے۔ حویلی سے ملی ہوئی گلی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ کسان اور مزدور زمیندار کے تالاب میں مچھلی مارنے جا رہے تھے۔ شبر تیا لوگوں کی آوازیں سُن کر چونکا ہوا۔ "اوف او۔ آج مچھلی کی سالانہ ٹپائی کا دن ہے۔ تالاب پر میلا سا لگا ہوا ہوگا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لوگ جمع ہونگے"۔ جال، سیلون، ٹاپے، ڈنڈے مختلف ناپ تول کے چھوکرے طرح طرح کے بوڑھے قسم قسم کے گپاڑے بھانت بھانت کے بے فکرے زمیندار لوگ لالہ پٹواری برابر مجمع کا مجمع شبر تیا کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اُسے ناقابل برداشت طور پر اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے اِس دکھ کا علاج پھر خیالات کی دنیا میں تلاش کیا۔ "آخر حلیمو اور سلمتا کو کوئی کچھ نہیں کہتا"! شبر تیا کے حافظہ نے اِس خیال کی فوراً تردید کی "نہیں، یہ دونوں تو کئی بار اپنے ماں باپ سے پٹے ہیں، اور اُس دفعہ جب عماد بابو کے یہاں سے سلمتا بھاگا تھا۔ تو پکڑے جانے پر عماد بابو نے اُسے کیسا ادھ موا کر دیا تھا مگر اُس کی بلا مانے۔ وہ پھر ایسا بھاگا کہ جنم جنم کا آزاد ہو گیا اور حلیمو انے تو کبھی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دیا"۔ شبر تیا کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ شاید اُسے اپنے درد کا درماں حاصل ہو گیا تھا۔ اُس کے دل میں بغاوت کی ایک تیز لہر اُٹھی اور اُس گھڑی وہ اپنے آپ کو آزاد اور سر بلند محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں! امیر لوگوں کے، زمینداروں کے، مہاجنوں کے لڑکے آزادی سے کھیلتے نہیں اور غریبوں

لے جاپون، مچھلی پھنسانے کے جال کی ایک قسم

کے وہ لڑکے بھی جو کسی کی غلامی نہیں کرتے اور شیروں کی طرح آزاد رہتے ہیں۔ وہ ظلم سہتے ہیں مگر من کے ہٹیلے ہیں اور وہی کر گزرتے ہیں جو اُن کا جی چاہتا ہے۔ اور دبّو، بزدل غریب لڑکے جنم بھر کولھو کے بیل ہی بنے رہتے ہیں۔ ہم اب حلیمو اور سلمتا کی طرح آزاد رہیں گے اور کسی کی نہیں سنیں گے، چاہے جو کچھ ہو۔"

"شبر تیا! ابے حرامزادے! ابھی تک جھاڑو ہی دے رہا ہے۔ ایک تو دوپہر کو سو کر اُٹھتا ہے اور اُس پر ایک کام میں سو پہر لگا دیتا ہے۔ کمبخت! کام چور! کوڑھی!"

بڑی بیگم کی قاہرانہ آواز دالان میں گونجی۔ شبر تیا سہم کر رہ گیا۔ اُس کے سارے باغیانہ ارادے، حکم برداری کی عادت کے اثر سے کافور ہو گئے۔ وہ جلد جلد جھاڑو دینے لگا اور جھٹ پٹ یہ کام ختم کر، غسل خانے سے گھڑا اٹھا، کنوئیں پر سے پانی لانے نکل کھڑا ہوا۔

پنگھٹ اور تالاب نزدیک ہی نزدیک تھے۔ راہ میں اور پنگھٹ پر شبر تیا مچھلی کے شکاریوں اور تماشہ بینوں سے ملا فصل کی کٹائی ختم ہونے والی تھی۔ کسانوں کے گھروں میں اناج کے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔ اپنی تھوڑی سی اور لٹ جانے والی پونجی کے وقتی قبضہ کے احساس سے بھولے بھالے کسان پھولے نہیں سماتے تھے لگن کا زمانہ بھی اب آہی چلا تھا۔ سب کے چہروں پہ آنی جانی مسرت کے عبیر و گلال لگے ہوئے تھے۔ جہاں شادمانی اور فارغ البالی کا قحط ہو وہاں حقیر سی خوشی کا سامان بھی بہت بڑا سرمایہ بہجت و نشاط ہوتا ہے۔ ؂

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

کھیت کے مزدوروں کی بے مائگی تو کسانوں سے بھی بڑھی چڑھی ہوتی ہے۔ یہ لنگوٹی

پر پھاگ کھیلنے والے سب سے زیادہ سرمست تھے۔ بیساکھ کا موسم اور گرہ میں تھوڑی مزدوری، پھر انہیں تاڑی کی لبنیاں لنڈھانے سے کون روک سکتا ہے۔ کوئی گاتا چلاتا ہے، کسی کا چہرہ بہروپی بنا ہوا ہے، کوئی ترنگ میں مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ بدن پر لنگوٹی مگر من میں موج۔ غرض ساری فضا میں کیف و انبساط کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ شبر تیا اُس سے بلا متاثر ہوئے نہ رہ سکا۔ اُس نے لہک کر ایک الاپ لگائی۔

ابلئی تے بھنواں وسارے پے سند لیبہ لیکے یار کے . . . . !

پیچھے سے سلمنا نے اُسے ایک چپت رسید کی۔ شبر تیا نے اُسے مڑ کر دیکھا اور آپ خوب کھلکھلا کر ہنسا

سلمنا بولا۔ "دور! غلام کا بچہ، آج بھی گھڑے ہی ڈھوتا رہے گا"

شبر تیا کے دل میں ایک تیر سا لگا۔ شرمندگی مٹانے کیلئے سلمنا کے گلے میں باہیں ڈال کر اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ کنوئیں پر گھڑا رکھ کر دونوں دوست تالاب کے کنارے چلے گئے۔ وہاں ان کے ہمجولیوں کی قوم مختلف ہیئت میں کھڑی ہوئی تھی۔

شبر تیا خود فراموشی و خود فریبی کے عالم میں دوسرے چھوکروں سے زیادہ خوش و خرم نظر آ رہا تھا اور سب سے بڑھ چڑھ کر کھیلوں اور شرارتوں میں حصّہ لے رہا تھا۔ لیکن یہ غم غلط کرنے کی گھڑی بہت ہی گریز پا ثابت ہوئی۔

"شبر تیا! ابے شبر تیا! بی بی تیرے کھوج رہی ہیں رے! جلدی جا نہ رے سالا . . ."

رام ٹہل سنگھ براہل کی گرجدار آواز نے سرمستی کے رنگین بلبلوں کو توڑ کر رکھدیا۔

شبر تیا ایک برق زدہ کی طرح کنوئیں پر واپس آیا اور پانی بھر کر منہ لٹکائے حویلی کی طرف گویا

کشاں کشاں چلا۔ حویلی میں بڑی بیگم نے شبر تبا کی آج غیر معمولی طور پر خبر لی۔

زمیندار کے دومنزلے کے رُخ پر ایک کھنڈر تھا جس میں دو بیر کے درخت اور چند ببول کی جھاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے لڑکے اکثر آ کر یہاں جمع ہوتے تھے، کھیلوں اور شرارتوں کے پروگرام بناتے اور کبھی کبھار یہیں کچھ کھیلنے بھی لگتے تھے۔ بیر کے موسم میں پاس کے نیچے مکانات بیر توڑنے والے لڑکوں کے ڈھیلوں کی زد میں ہوتے ہیں۔

مچھلی کے شکار کے ایک ہفتہ بعد، ایک روز شبر تبا دومنزلے کے سائبان کے جنگلے سے لگا کھڑا تھا۔ اُس روز بھی زمیندار کا بچہ اُس کی گود میں تھا۔ سامنے کھنڈر میں بہت سے لڑکے جمع تھے ایک جماعت لٹو کھیل رہی تھی۔ ایک ٹولی بیر کے درخت کے سایہ میں تاش سے شغل کر رہی تھی اور ایک تیسرا گروہ چھپی کے کھیل میں مشغول تھا۔ غریب شبر تبا سکتہ کے عالم میں حسرت سے سب کو دور سے تک رہا تھا۔ خاموش، اداس، مضمحل۔ تھوڑی دیر میں لڑکے سب کھیل سے اُکتا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں کسی تازہ مہم کی کھچڑی پکنے لگی۔ کچھ رد و کد کے بعد بہ اتفاق رائے یہ طے پایا کہ بابو منظہر کے آم کے باغ کی طرف رُخ کیا جائے۔ اُسی کے قریب بابو جاگو سنگھ کا باغ بھی تھا۔ جیٹھ کے مہینے میں آم پک کر گرنے لگ جاتے ہیں اور رہیم خام پھلوں کی تو کثرت ہوتی ہے۔ چلتے چلاتے عیدوا، بقر عیدوا اور رحموا نے شبر تبا کو دومنزلے پر دیکھ پایا۔ سب لڑکے اُسے پکارنے لگے۔ شبر تبا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور کہا:-

"ایک دن ہم بھی آدیں گے۔ ایک دن ضرور آدینگے اور خوب خوب کھیلیں گے، خوب خوب خوب"

وہ اس تخیل سے لذت لے رہا تھا۔ لڑکے سب چلے گئے اور اب اُن کے قہقہوں کی صرف گونج باقی رہ گئی۔ شبر نیا دور کھنبوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے دل کی ساری حسرتیں اُس کی بے آس مگر آرزو مند نگاہوں میں آکر منجمد ہو گئی تھیں۔ اس کے تصور میں تصویریں بن اور مٹ رہی تھیں اور اُس کی بے تاب روح اتھاہ بے کیفی کے سرد غار میں ڈوبتی جاتی تھی۔ اس کے جذبات دم توڑ رہے تھے اور اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انتہائی پسپائی اور شکستگی کے بطن سے انقلاب جنم لیتا ہے کسمپرسی اور مظلومی کی خاکستر سے بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ دوسرے روز بے بس اور بے زبان شبر نیا سب کی آنکھوں کے سامنے زمیندار کے گھر سے دوڑتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ وہ جا کر اپنے ہمجولیوں سے مل گیا۔ اُس نے ہر کھیل میں شرکت اور بے باکانہ شرکت کی، اُس نے خوب کبڈی کھیلی، خوب لٹو نچائے، خوب خوب آم کے باغوں کو غارت کیا، چھٹے ہوئے گھوڑوں پر چڑھا، تالابوں میں مچھلیاں مارتا رہا اور نہ جانے کس کس طرح اُس نے اپنی حسرت نکالی۔ اُسے نہ کھانے کی فکر تھی نہ پینے کا غم وہ اپنے ماں باپ کے گھر بھی نہیں آتا تھا اور دن رات ہوا کی طرح آزاد رہتا تھا۔ راتیں پہاڑی پر اور باغوں میں کاٹ دیتا تھا اور دن قسم قسم کے کھیل کود میں۔ شبر نیا کی طبیعت میں ایک زبردست اُبال آیا ہوا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اُس دباؤ کا ازالہ کر رہا تھا جو اُس کی خواہشوں پر عرصہ تک ڈالا گیا تھا۔ اُس پر ایک ہیجان کی کیفیت طاری تھی ایک بحران کا عالم۔

بڑی بیگم نے برائیوں کی وساطت سے شبر نیا کو گرفتار کروانا چاہا مگر وہ ہتھے نہ چڑھا۔ کامل ایک ہفتے شبر نیا اُسی بحرانی حالت میں جیٹھ کی دوپہروں کی دھوپ میں مارا پھرا۔ نہ کھانے

کا ٹھکانہ، نہ سونے کا ساماں، اس غیر معمولی زندگی سے شبر تیا کو شدید بخار آگیا۔ اُس کے باپ نے
اُسے ایک شام آم کے باغ میں بخار سے جلتا ہوا پایا اور اُسے اٹھا کر گھر لے آیا۔

شبر تیا کے بخار نے سرسامی رنگ اختیار کر لیا۔

بڑی بیگم کے پنجے سے آزاد۔۔۔ نہیں نہیں ہم نہیں اٹھیں گے، ہم خوب سوئیں گے
ماما میراں، بوڑھی لینیا —— وہ میرا کیا کر سکتی ہے؟ ہم آزاد ہیں!! ہم خوب کھیلیں گے۔۔۔۔
خوب! خوب!! خوب!!! سلمتا! حکیموا، واہ دوست! ہم آزاد۔۔۔ چل کبڈی تارا
سلطان گنج مارا۔۔۔" شبر تیا سرسام میں بڑبڑا رہا تھا۔
تیسرے روز شبر تیا مر گیا۔ اُس نے زندگی کا آخری کھیل بھی کھیل لیا۔ اُس کی حسرتوں
کی مکمل تسکین ہو چکی تھی۔

اندھی نگری

دولت رام نئے زمانہ کا ایک ہوشیار کاروباری آدمی تھا۔ ہندوستان کے پرانے تجارت پیشہ لوگوں کی طرح بے علم و کم سواد نہیں بلکہ خاصا پڑھا لکھا۔ آئی۔ اے تک انگریزی بھی پڑھی تھی۔ مگر فیل ہو کر اس نے اپنا کاروبار سنبھال لیا تھا۔ موتی رام کی یہ دور بینی تھی کہ زمانہ کی ہوا دیکھتے ہوئے اس نے اپنے لڑکے کو تعلیم کی بوباس سے بے بہرہ نہیں رکھا۔ مگر آئی۔ اے پاس کرنے سے کیا حاصل۔ خاندانی بیوپار میں لگنے ہی سے لکشمی دیوی کی دیا کی امید تھی۔

دولت رام نے اپنے خاندانی کاروبار کو کافی وسعت دی تھی۔ اب اجناس کی آڑھت کے علاوہ آٹا اور چاول مل کا نصف اور روئی کے گودام؛ نیز کتابوں کی ایک بڑی دکان کا وہ بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ دو تین سال سے دولت رام نے اسکول کی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا

کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ہر چند کہ وہ اس بازار کے مقابلہ میں نسبتاً نو وارد تھا پھر بھی اپنی تعلیم اور ہوشیاری کامرانی کے سبب اُس نے کئی پُرانے کاروباریوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ نئی ملکی حکومت کی جدید تعلیمی تحریکوں کے سلسلے میں اُس نے چارٹ اور ریڈریں مفت تقسیم کر کے حب الوطنی کا نمایاں ثبوت دیا تھا یہ اور بات ہے کہ حکومت کی چھپائی کے کام سے اسکے منظرِ عام سے ہٹکر بھارت سیوا کی قیمت نفع کے ساتھ وصول لی تھی۔ بیوپار کے ہیر پھیر بیوپاری ہی جانیں تاہم اس کلجگ میں دیش سیوا بڑی قدر کی چیز ہے۔

دولت رام کی ہر جگہ عزت و منزلت تھی۔ کئی آشرم اُس کے طفیل سے چل رہے تھے۔ کئی سبھاؤں اور سمیتیوں کا وہ صدر تھا۔ دولت رام کے "ودیا بھنڈار" سے ایک ماہوار رسالہ ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں نکلا کرتا تھا۔ اس کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ دولت رام کو اپنے ملک کی جہالت سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جنتا کو تعلیم کا متوالا بنوانے اور انہیں کتابیں مہیا کرنے کا ٹھیکہ بلکہ مطلق اجارہ لے لینا چاہتا ہے۔ نئی نئی تجویزیں اور پرائمری ریڈروں کیلئے جدید ترین طریقے برتنے کی فکر دولت رام کے قیمتی اوقات پر چھائی رہتی تھی۔ کم از کم اس کے رسالے سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ہزاروں ہزار روپے ماہرین تعلیم کی ذات پر بے دریغ خرچ کئے جاتے تھے۔

اسی وجہ سے ودیا بھنڈار کی کتابیں اور ریڈریں نہایت ہی اعلیٰ پایہ کی چیزیں تھیں۔ دولت رام کو اگر افسوس تھا تو یہ کہ اسکولوں میں اس کی اول درجہ کی کتابوں کے ساتھ کمیٹی کے لوگ تیسرے درجے کی چیزوں کی سفارش بھی کر دیا کرتے تھے اور اس کے نتیجہ میں ملک کے نونہال مکمل طور پر عصری تعلیمی فائدوں، بہترین انتخابات اور بےمثال علمی پیشکش سے فائدہ اٹھا نہیں سکتے تھے۔ جیسے جیسے دولت رام کا سالانہ نفع بڑھتا اور اس کے مختلف کاروبار کی وسعت و اہمیت میں اضافہ ہوتا

وہ بیوپار میں مرکزیت کا قائل ہوتا جاتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حکومت کو غیر ضروری تجارتی مقابلے کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ اس سے دیس کا نقصان ہوتا ہے اور کاروباری خرچ بہت بڑھ جاتا ہے جس کی زد خریداروں پر بھی پڑتی ہے۔ غرض اس کی یہ تمنا تھی کہ اس کی تجارت کے راستے کے روڑے بالکل ہٹا دئے جاتے۔ اُسے غصہ اور تعجب ہوتا کہ حکومت کیوں ان باتوں کو نہیں سمجھتی مگر دولت رام اس بات کو بھی نا انصافی تصوّر کرتا تھا کہ حکومت تجارتوں کو مرکزی حیثیت دیکر اپنے اختیار میں کرے۔ اس کے نزدیک اس سے ملک کی قوتِ کارکردگی اور چیزوں کی خوبی و نفاست میں گراوٹ آجانے کا یقینی خطرہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت کے افسر تو محض بھاڑے کے ٹٹو ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے۔ جب قومی حکومت نے متحدہ زبان کی ایک کمیٹی بنا کر ابتدائی تعلیمی کتابوں کو اس کے ماتحت کر دیا اور مصنفوں کو براہِ راست اُس سے سروکار رہنے کا خدشہ پیدا ہو گیا تو دولت رام درپردہ اس اسکیم کی سخت مخالفت کرنے لگا۔ اس کے روپوں کی مدد سے بہت سے فرقہ پرستی کے شاخسانے نئی کمیٹی کی مخالفت میں کھڑے کر دئے گئے۔ وُہ تو پُرانی کمیٹی ہی کو اس سے ہزار بار بہتر سمجھتا تھا۔ ہاں تھوڑا خرچ زیادہ ہوتا اور حاجب و دربان کی خوشامدیں اور کیا ؟ چھوٹے پونجی کے بیوپاریوں کو تو اس نے قریب قریب ختم کر ہی دیا تھا۔ بس یہی لالہ سری رام "قومی پریس" والے اور "دلیش ودیا پرچار" والے سیٹھ ہرگوبند داس جوڑ کے تھے دولت رام ان سے خار کھاتا تھا۔ اُس نے اشاعت کے کاروبار کو سیٹھ ہرگوبند سے ملا لینا چاہا۔ لیکن ہرگوبند راضی نہ ہوا اور لالہ سری رام سے دولت رام کا توازلی بیر تھا۔

"میلارام کی ماں! میلارام کی ماں!" ——— دولت رام انگڑائی لیتا ہوا آج صبح دیر سے بیدار ہوا۔ رات گئے تک وہ کاروبار کے جھمیلوں میں پھنسا رہا تھا۔ ابھی ابھی اس کی بیوی اس کے خراٹے سن کر کمرے سے دبے پاؤں واپس چلی گئی تھی۔ چلتی ہوئی سڑک پر ایک گھڑ گھڑاتی ہوئی لاری کے شور سے وہ جاگ اٹھا۔ اس کی آواز سن کر اس کی بیوی آ گئی۔

"کیا جی جاگ گئے؟"

"ہاں! لوٹے میں پانی تو لا! اسلپان تیار ہے نا؟ آج مجھے بہت سے کام ہیں۔"

دولت رام نے پھر ایک زبردست انگڑائی اور دنداں نما جماہی لیتے ہوئے اپنی ڈھیلی اور بے ربط دھوتی کو درست کرنے کی کوشش کی۔

منہ ہاتھ دھو کر دولت رام پوریاں اور مٹھائیاں کھانے بیٹھا۔ گھر کے باواجی نے سوجی کا گرم گرم حلوا لا کر پیش کیا۔ میلارام کی ماں کھڑی پنکھا جھلتی رہی۔

"میلارام کی ماں! سنتی ہو؟ سیٹھ کرشن چندر کا مورن کب ہے؟"

"اکادشی کے دوسرے دن برہمن نے بتلا بچارا ہے۔"

"اچھا جب بھی ہو کہنا یہ ہے کہ بہو کو خوب گہنے پاتے سے لال پیلی کر کے لیجانا۔ کان میں ہیرے کا ہیرنگ۔ وہی جو میں نے کلکتہ سے اب کے لایا ہے۔ لوہے کی تجوری میں بند ہے نیب جی سے منگوا لیجیو سمجھیں اور ہاں تم بھی..." دولت رام نے ذرا ہنستے اور نوالے فرو کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "... بھری سبھا میں سب پر بازی لے جاؤ تو بات ہے۔ آدمی ایسے ہی دنوں کے لئے کماتا کھاتا ہے نا۔ برادری اور جان پہچان کے لوگوں میں ناک اونچی رہے۔ سری رام اور

ہر گوبند نے سمجھا کیا ہے۔ میری بہو کی گود بھرے تو چھٹی ہی میں وہ دھوم مچاؤں گا کہ یاد کریں گے اور اگی! اُس طور سے نام بھی تو پھیلتا ہے۔ سری رام کا دھیان آتے ہی دولت رام سنجیدہ ہو گیا۔ اُسے کمیٹی میں ریڈروں کے پیش کرنے کی آخری تاریخ یاد آگئی۔ اُس نے جلپان جلد ختم کیا سیاہ و بالیدہ کھلی ہوئی توند کی سطح پر زلزلے کے سے آثار نمایاں ہوئے اور پھر دو تین گرجدار ڈکاریں پتیل کی چھوٹی سی تھالی سے اُس نے الائچی، لونگ اور سپاری لی اور انہیں چباتا ہوا باہر گدی کو چل دیا۔ دولت رام کی گدی پرانی وضع کی نہ تھی۔ میز کرسیاں لگی تھیں اور میز پر ایک ٹیبل فین اور دوسری جانب ٹیلیفون، کمرے میں دوسری میز سے لگا ہوا اُس کا سکریٹری گپتیشور ورما بیٹھا ہوا کام میں لگا تھا۔ پاس ہی دوسرے کمرے میں پرانی وضع کا عملہ دری اور گدیلوں پر بیٹھا ہوا لکھنے پڑھنے میں غرق تھا۔ منیب جی اُسی کمرے میں لوہے کی بڑی سی تجوری سے لگے بھی کھاتہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی گدی کے پاس کچھ دور تک سُرخ اگرنگا دیوار پر چڑھایا گیا تھا اور اس پر پٹی کے سنہرے۔ روپہلے پھول چھپے ہوئے تھے۔ دولت رام کے کمرے کے باہر سامنے سبز جھبوں پر ایک نیپالی سپاہی مسلح کھڑا پہرا دے رہا تھا۔

دولت رام نے کھونٹی پر سے جاپانا سلک کا کرتہ اتار کر پہنا۔ سونے کے بٹن سلک کے ہمرنگ تھے۔ پنکھے کا بٹن دبا کر وہ گھومنے والی گدے دار کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دستی پر "پارکر" کا شنگرفی قلم اٹھایا اور مشہرہ ریڈروں کی تیاری اور اُن کے منظور کرانے کا خرچ اور متوقع نفع کا حساب جوڑنے لگا۔

"اچھا تو چار کلاسوں کے لئے صوبہ بھر میں، چالیس ہزار ریڈریں چاہئیں۔ سال بھر میں اتنی

کھپت تو ہو ہی جائیگی۔ چار آنے فی ریڈر مرد و حصّہ کے حساب سے دس ہزار روپے ہوئے۔ تین ہزار کاغذ اور چھپائی کا خرچ، اور پیروی کا خرچ؟ تین ممبروں کو ہزار ہزار اور دو کو پانچ پانچ سو کل چار ہزار بھگول (جغرافیہ) اتھیاس (تاریخ) اور حساب کی ریڈریں تو داخل ہو ہی چکی ہیں اور یہ چوتھی۔ تو ایک ہزار پیروی پر خرچ پڑا۔ اور منظوری کے بعد ریڈروں کو چلانا۔ ہونہہ! ایک ساتھ کئی ریڈریں منظور کر دینی بھی کوئی انصاف ہے۔ بس صرف پریشانی اور خرچ۔ اب اسکولوں میں ان کی اُن کی خوشامدیں کرنی۔ یہ کمیٹی والے بھلے مانس نہیں۔ اچھا تو اس سیرز پر پانچ سو اور۔ پھر نام کا مول فی کلاس سو روپے۔ چار سو یہ ہوئے اور اوپر کا سو۔ یہ ایک ہزار ہوا۔ کل خرچ پانچ ہزار ہوئے اور آمد دس ہزار۔ نفع پانچہزار۔ تین سال تک بھی اگر ریڈریں چل گئیں تو پندرہ ہوئے، پندرہ ہزار۔ گپتیشور گپتیشور! کمیٹی میں ریڈریں داخل کرنے کی کونسی آخری تاریخ ہے؟"

"جی! ۲۵ اگست" گپتیشور نے جھٹ سے ڈائری دیکھ کر بتایا۔

"بس بیس دن۔ اچھا ہو جائے گا۔ دیکھو آج ہی اُن تین ممبروں سے ہزار ہزار اور دو سے پانچ پانچ پر معاملہ طے کر لو۔ بھنڈار کی سب باتیں منظور ہوں۔ آدھا ابھی دے دینا اور آدھا منظوری کے بعد، سمجھے۔ "صاحب" کی آج ہی شام کو پارٹی ہے۔ ہوٹل کو فون کر دو کہ سب انتظام ساڑھے چار بجے ہی سے ٹھیک رہے۔ واپسی پر میں کامیشور بابو اور کریم صاحب سے نام کے مول کے لئے مل لوں گا اور ہاں تربینی بابو سے بھی میں ملتا ہی آؤں گا۔ میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔ سنا ہے وہ ایک مہینے سے بیمار ہیں۔"

"بہت اچھا" گپتیشور نے توجہ سے ساری باتیں سُنکر جواب دیا۔

دولت رام اپنی دی ہوئی پارٹی سے بہت خوش و خرم لوٹا۔ "صاحب" نے اس کی بہت تعریفیں اپنی تقریر میں کی تھیں اور اس کا شکریہ بڑے پُر جوش انداز میں ادا کیا تھا۔ اس شکریہ اور تعریفوں کی جذباتی قیمت کے علاوہ تاجرانہ اہمیت بھی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ دوسری صورت دولت رام کے سے گرگ باراں دیدہ کیلئے زیادہ اہم تھی اور یوں تو اس زمانہ شناس بیوپاری کے مزاج میں عام انسانی جذبہ کا پہلو بھی افادیت کے رجحان کیساتھ اتنی مضبوطی سے وصل ہو چکا تھا کہ اس کی کوئی لذت و مسرت اسوقت تک مکمل نہ ہوتی جب تک دونوں عناصر موجود نہ ہوں۔ برادری اور جان پہچان میں بھی وہ اسلیئے ناک اونچی رکھنی چاہتا تھا کہ اس کا اشتہار ہو اور اسکی ساکھ خوب پھیلے اور مستحکم بنے۔ سماجی شہرت اور کاروباری اشتہار میں اُس کے نزدیک کوئی خاص اَل بل نہ تھا۔ خیرات، نیک برتاؤ اور حسنِ سلوک کی وہ کوئی مطلق اخلاقی قدر نہیں پہچان سکتا تھا۔ دولت رام کے نزدیک یہ بھی سود مند یا نہیں ہو سکتی تھیں۔ "صاحب" کی پارٹی اس کیلئے مسرت و انبساط کا سرمایہ تھی۔ وہ اپنے موٹر پر خوب پھیل کر بیٹھا۔ خون کی موجوں اور رخساروں کے ابھار سے اسکی چھوٹی چھوٹی ہوشیار آنکھیں زیادہ اندر ڈوب گئیں اور اسکی توند کچھ اور ابھر آئی۔ راہ میں وہ کابیشور بابو کے یہاں اترا اور انہیں لیکر کریم صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ کچھ دیر تک تو پارٹی کی باتیں ہوتی رہیں۔ دولت رام نے "صاحب" کی مہربانیوں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ موقع بے موقع اپنے انگریزی دانی کا ثبوت بھی انگریزی الفاظ استعمال کر کے دیتا رہا۔ کریم صاحب کے پاس ولایت کی ڈگری جو تھی۔

"مسٹر کریم صاحب! ہمارے پارکر صاحب گریٹ مین ہیں گریٹ مین اور اس پر ہم غریبوں، پُوادرین کا اتنا خیال اور ٹاک، لننے پر ہم سے کرتے ہیں صاحب" کابیشور بابو کہ

"ونڈر فل"! کچھ اور تجربہ کارانہ تمہیدی گفتگو کے بعد دولت رام اصل مقصد کی طرف آیا۔

"بھلا آپ لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ان ریڈروں پر اپنا قیمتی وقت برباد کیجئے۔ آپ لوگوں کا سمئے تو بڑی بڑی باتوں اور ضروری کاموں میں بیتتا ہے۔ میرے لئے تو آپ لوگوں کا نام ہی بڑی چیز ہے آپ جیسے افسروں اور قابل آدمیوں کا نام ہی چھپنے سے میرا دلدّر دور ہوتا ہے۔"

"سیٹھ جی میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ حاضر ہوں حکم ہو!" مسٹر کریم نے اخلاقاً کہا

"اجی نہیں حضور! آپکی سیوا تو میرا فرض ہے۔ بس اپنی غرض سے آپ کی خدمت کرنے آیا تھا۔ کاملیشور بابو بہت پرانے مہربان ہیں۔ بس ایک چھوٹا سا کام تھا یہی ریڈروں کے بارے میں ... جی ہاں مسٹر کریم! سیٹھ صاحب اس صوبہ میں سکھشا اور ایڈوکیشن کے بڑے پالن کرنے والے ہیں۔ مجھ سے تو یہاں تک بن پڑا میں نے ان کی ہر دم سہائتیہ کی ہے۔ ... اب یہ آپ سے بھی مدد لینی چاہتے ہیں ..."

گھناؤنی حقیقت پر ریشمی چادر اڑھا اور ضمیر و انصاف کا نرمی سے گلا گھونٹ کر کچھ ایلیمنٹری پینترے کے بعد مسٹر کریم ریڈروں پر اپنا نام کاملیشور بابو کی شرکت کے ساتھ دینے کیلئے اس شرط پر راضی ہو گئے کہ انہیں ذرا دیکھ بھی لیں گے۔

مسٹر کریم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ پھر تو مفت کے روپوں کی چاٹ لگنے کی دیر تھی اور بس کاملیشور بابو راہ و رسم منزل کے پرانے واقف کار تھے۔ دو دو سو روپے فی کس پر نام کا مول ہو گیا۔ ام۔ اے۔ ام۔ ای۔ ڈی اور ڈپ ان اڈ (لنڈن) کو خرید کر دولت رام خوش خوش موٹر میں آبیٹھا۔ تھوڑی دیر میں اس کا شاندار موٹر ایک متیندل سے فرسودہ و بدحال مکان کے سامنے

آکر رُکا، موٹر کے ہارن کی مسلسل آواز سنکر ایک مریل سا لڑکا پھٹی ہوئی دھوتی پہنے باہر نکلا۔

"تربینی بابو ہیں ؟" دولت رام نے کار کی پچھلی سیٹ سے سر نکال کے دریافت کیا۔

"جی ہیں۔ بیمار ہیں مگر ہم اُن کو جا کر فوراً خبر دیتے ہیں"۔

لڑکا موٹر کی عظمت سے متاثر ہو کر بھاگتا ہوا اندر گیا اور جو واپس آیا تو تربینی بابو بھی نقاہت کے ساتھ اس کے پیچھے آتے ہوئے دکھائی دیئے

"اخاہ! تربینی بابو، آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے بلوا لیتے۔ آپ بیمار ہیں۔ کھیم کشل تو کہیے اب تو شریر آنند ہے نا؟ مجھے آپ کی بڑی فکر تھی"۔

دولت رام نے اس پوچھ گچھ کی قیمت اچھی طرح سمجھتے ہوئے گفتگو شروع کی۔

"ایشور کی کرپا ہے۔ آپ کی دیا ہے، پہلے سے اچھا ہوں"۔

تربینی بابو کے جواب دیتے دیتے دولت رام موٹر سے اتر آیا۔ اُن کیلئے یہ باعث فخر تھا کہ سیٹھ دولت رام اُن کے گھر آئے۔ وہ فوراً تیزی سے کرسی لانے اندر گئے اور اُسے جھاڑ پونچھکر بچھایا اور خود بھی ایک لوہے کی میلی سی پرانی کرسی پر دولت رام کے مقابل بیٹھے۔

تربینی بابو ایک مقامی نجی اسکول کے ماسٹر تھے۔ ہندی کی اچھی جانکاری رکھتے تھے کم مشاہرہ کے سبب اُن کی چادر پاؤں سے ہمیشہ چھوٹی ہی رہتی تھی اور اس پر مشاہرہ ملنے میں بدنظمی، کسی طرح لڑکوں کو گھر پر پڑھا کر اور کچھ لکھ لکھا کر سفید پوشی نباہے جا رہے تھے۔ ایک مہینہ قبل ان کو پلیوریسی ہوئی تھی اور اب تک وہ کمزور تھے۔ دو مہینے اسکول سے چھٹی لے لینی پڑی تھی۔ آدھے مشاہرہ پر بیماری میں خرچ دوگنا اور آمد نصف۔ اور وہ بھی کام پر واپس جانے کے بعد۔ قرض

اور ادھار پر مشکلوں سے گذر بسر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام۔ وافر مقوی غذا، دودھ، مکھن اور پھل بتایا تھا۔ پروٹین، فیٹ، کیلشیم اور وٹامن، جنتا کی محنت کی طرح سستے داموں تو ملتے نہیں۔ تربینی بابو کی صحت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھی۔

"بڑی کرپا کی آپ نے سیٹھ جی، کدھر آنا ہوا؟ میں آپ کی کوئی خاطر بھی تو نہیں کر سکتا" تربینی بابو واقعی رنجیدہ ہوتے ہوئے بولے "پان الائچی لاؤں؟"

"نہیں جی کوئی بات نہیں۔ مجھے ریڈروں کے وشے میں آپ سے بات کرنی تھی۔ آپ بیمار تھے میں ہی چلا آیا" دولت رام نے تمہید کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"دیا ہے آپکی ہم غریبوں کو یاد رکھتے ہیں آپ" تربینی بابو جذبۂ تشکر کے ساتھ بولے

"آخری تاریخ ریڈروں کے داخل کرنے کی پچیس ہے۔ آپ آج ہی سے کام میں لگ جائیے۔ ادھر آپ لکھتے جائیں۔ ادھر ریڈریں چھپتی جائیں۔ ذرا اچھے طریقے سے لکھئے گا اور زبان آسان ہو۔ زیادہ محنت نہیں ہے۔ ارے وہی پرانی باتوں، قصے کہانیوں کو الٹ پھیر کر لکھنا اور کیا" سیٹھ نے چالاکی سے کہا

"سیٹھ جی بالکوں کی سکشا بڑی کٹھن چیز ہے۔ اگر نئی روشنی میں ریڈریں لکھی جائیں تو کافی محنت کرنی پڑے گی۔ اب کے دفعہ سچ مچ نئے نیم (قاعدے) سے لکھوائیے تو بہت اچھا ہو مگر وقت کم ہے۔" تربینی بابو نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔

"آپ کیا باتیں کرتے ہیں تربینی بابو، ارے۔ ہم نے، آپ نے، سبھوں نے اسی پرانی ڈگر پر چل کر ہی پڑھا لکھا نا۔ اب یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ قابل لوگ اپنی بدھی جتاتے پھرتے

ہیں۔"

دولت رام نے محسوس کیا کہ یہ دلیل تربینی بابو کے دل کو نہیں لگ رہی ہے تو اُس نے دوسری بات پیش کی۔ . . . "بھائی ان ریڈروں کی تجارت میں کچھ نفع ہے کہ کوئی اتنا سر کھپائے افسروں اور ممبروں کی پُوجا کرتے کرتے تو دیوالہ نکل جاتا ہے۔ یہ مفت خورے! اور ہماری سرکار؟ ہیں ہیں ہیں۔ اندھی نگری چوپٹ راج، کشٹ تو ہم سہوں اور جیب گرم ہو کرسی پر بیٹھنے والوں کی۔ اگر انہیں کوئی پبلشر دے ہی نہیں کچھ تو؟" تربینی بابو نے ایک بات پیش کی۔

"یہی تو ہے۔ بس اندھا مقابلہ۔ سری رام ہیں، ہرگوبند ہیں اور بہتیرے۔ کس کس کو روک لے گا۔ مجھے جو سرکار اسکول کی کتابوں کا اجارہ دے دے تو پھر دیکھئے میں کیا سے کیا کر دیتا ہوں خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، تربینی بابو آپ کو اس سے کیا فائدہ۔ وقت کم ہے۔ آج ہی سے کام کو ہاتھ لگا دیجئے۔ چالیس روپے آپ کے محنتانہ کے ہوئے، منظور رہے نہ؟ اب کے آپ بیمار ہیں۔ پانچ روپے آپ کے پھل پھلاری کھانے کے لئے زیادہ دوں گا۔ مولوی صاحب سے اردو ریڈر میں مدد لینے کے لئے بھی پانچ روپے اور سہی، لیجئے پورے پچاس پہ بات طے ہو جائے۔"

دولت رام نے فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے ٹرم پیش کیا۔ بس تھوڑی سی دقت کو دور کرنے کی یہ سبیل تھی۔ تربینی بابو شاید بیماری کے سبب صرف چالیس روپے میں انکار کر دیں، تو دوسرا آدمی ٹھیک کرنا پڑے گا۔ پچاس پر کیا انکار کریں گے۔ بیماری میں خرچ بھی تو زیادہ ہوتا ہے سیٹھ کو اطمینان تھا

تربینی بابو خاموش تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اس کے سوا چارہ کیا ہے
ریڈریں لکھ کر وہ خود کمیٹی میں پیش کرنے سے رہے۔ پیروی کا خرچ کہاں سے آئے گا۔
ڈاکٹر نے البتہ انہیں محنت کرنے سے منع کیا تھا۔ ایک مہینہ اور مکمل آرام۔

دولت رام سوچ رہا تھا —— شام کی پارٹی۔ صاحب کی تعریفیں۔ ریڈروں کی منظوری، پندرہ ہزار روپے، سماج میں ناک اونچی۔ سونے اور جواہر سے لدی ہوئی لال پیلی بہو —— شہرت اور —— رات کے بھوجن میں حلوا اور تسمئی۔

تربینی بابو کے دماغ میں بھی خیالات منڈلا رہے تھے۔ مکمل آرام۔ محنت۔ قرض بلوں کی ادائیگی۔ کیلیشیم اور وٹامن۔ بیوی کی پھٹی پھٹی ساڑیاں۔ پچاس روپے۔ پلیوریسی تھائیس ریڈریں —— اور اندھی نگری۔ . . . .

آخر انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "لکھوں گا سیٹھ جی۔"

دو مائیں

رات بھر بچہ روتا رہا۔ گوری اسے لاکھ چپ کرانے کی کوشش کرتی مگر اُس کا رہ رہ کے رونا
بند نہ ہوا۔ کبھی تو روتے روتے اسکی گھگھی بندھ جاتی۔ اُس کا ننھا سا نازک چہرہ تمتما کر لال بھبھوکا بن جاتا
اور کبھی تھک کر خود وُہ نڈھال سا ہو جاتا۔ منہ ہلدی کی طرح پیلا، گردن ڈھلک جاتی اور سانس
تلے اوپر۔ پھر وُہ بھوک سے تلملا کر بلبلانے لگتا اور وہی اضطراب۔ گوری کا کلیجہ اس وقت
بالکل پھٹ جاتا۔ جب وُہ ننھی سی جان اپنی معصوم، دردناک و ملتجی آنکھوں سے ماں کی طرف
تکتی اور اُس کے پھول سے نازک لب بلکنے لگتے۔ گوری ایک اتھاہ درد، محبت اور قربان ہو
جانے کے احساس سے بے چین ہو جاتی۔ وُہ اپنی روح اور دل میں ایک قاتل خراش محسوس کرتی
اس کا رواں رواں کراہ اٹھتا اور اُس کی آنکھیں اُمنڈ آتیں۔

پڑوسنوں نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ دودھ اتارنے کے لئے مسور کی دال گھی ڈال کر کھائی جائے اور بتیسے اور منگریلے کا لڈو۔ گوری کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھولو کی خاطر دنیا بھر کے منگریلے اور مسور کی دال کھا جائے مگر سب کچھ سوچ کر اس کا جی بیٹھ جاتا اور وہ ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتی اس کی چھاتیاں خشک ہی رہیں اور آنکھیں پُرنم۔

بھگوان نے شادی کے کئی سالوں کے بعد گوری کی گود بھری تھی۔ بھولو نے بڑے مان منت چیڑھ چڑھاوے پر جنم لیا تھا۔ چھٹھ میں اس نے برت رکھی۔ درگا مائی کے چرنوں میں سر جھکایا اور کتنے سنت سادھوؤں کی سیوا کی، تب جا کر یہ مُنّا سا بھولو آیا تھا۔ اگر اس کی کوکھ ہری نہ ہوتی تو نربنسی کا گوری پر کتنا بڑا الزام آتا۔ بھولو بڑے ارمانوں کا تھا۔ ماں باپ کی پہلی اولاد۔ ہرنس اور گوری بھولو کی صورت میں اپنا نیا جنم محسوس کرتے تھے۔ زندگی اُن کیلئے بھولو کے دم سے زیادہ طویل، وسیع، گہری اور بامعنی ہوگئی تھی۔ وہ اس کی مبہم سی مسکراہٹوں اور بے نام سی کلکاریوں میں زندگی کے دکھ بھول گئے تھے۔ گوری تو بھولو کیلئے اپنا پران بھی تیاگنے کے لئے تیار تھی۔ وہ اُس پر ہر وقت جان چھڑکتی رہتی مگر محض خواہش اور جذبہ محبت سے تو سینے میں دودھ اُتر نہیں آتا۔ گوری تو چاہتی تھی کہ اُس کی چھاتیوں سے گنگا جمنا کے دھارے بہہ نکلیں۔ مگر چشمہ زمزم کی جگہ اُس کے سینے ایک ویران ریگستان کی طرح تھے۔

بھولو قریباً دس مہینوں کا تھا۔ پار سال کی بھری برسات کے بعد یہ پیدا ہوا تھا۔ پار سال جب برسات کی بہار، دھرتی کا سہاگ اور کھیتوں کا شباب قائم تھا۔ آسمان پر حاملہ عورت کی طرح اُمڈے ہوئے بھرپور کالے کالے بادل اُٹھتے تھے، آہر لو کھر محبت سے بھرے ہوئے دل کی صورت چھلکنے

پڑتے تھے اور دھان کے کھیت نوجوان آنچلوں کی مانند لہراتے تھے۔ گاؤں کے کسان آنند تھے اور اُن کی مطمئن نگاہوں میں زندگی کی تعبیریں و خاموش لَے کے جلوے نمایاں۔ ماضی کے دُکھوں کو جلد بھول جانے والے اور مستقبل کی ممکنہ المناکیوں سے بے خبر سادہ لوح کسان حال کے سکھ چین کی توقع میں مگن تھے۔ بھولو ایسی ہی شبھ گھڑی میں اس جگ میں آیا۔ ہربنس گوپ اندر دیوتا کی طرح نہال تھا اور گوری اپنے کو پاربتی دیوی سے زیادہ خوش قسمت سمجھ رہی تھی۔ خود دھرتی کا سارا جوش اور نکھار، اس کی پیداوار کی ساری شکتی اور اس کی فصلوں کی بہتات کا سارا غرور گوری کے رُوپ میں مشاہدہ کیا جاسکتا تھا۔ اُس کی بھری ہوئی گود کی وسعت میں آکاش اور پاتال، زمین و زمان سب گم ہوئے جاتے تھے اور اُس کی اُبلتی ہوئی ہنسی میں جیون کے مچلتے ہوئے مدھر دھاروں کے راگ سُنے جاتے تھے۔ گوری نے ساری مانی ہوئی منتیں اتاریں اور گھر والوں نے سب رسمیں پوری کیں۔ ہربنس گوپ کے یہاں سال بھر بڑی دھوم دھام رہی۔

سال شفقِ شام کی مانند گزری ہوئی صدیوں کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ اساڑھ آیا مگر چنچل کنواریوں کی طرح بدلیاں نہیں جھومیں۔ ساون گذر گیا۔ لیکن لچکتے کولھوں والی سہاگنوں کی صورت ابر اٹھلا اٹھلا کر نہیں برسا۔ بھادوں بھی چلا گیا پر ساری دھرتی بیوہ کی طرح ویران، اُداس، نڈھال پڑی رہی۔ شروع اساڑھ میں کچھ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ کسانوں نے گھر کا غلّہ کھیتوں میں جاکر ڈال دیا۔ بھگوان جو ٹھہرے۔ بھاگ کو ابھاگ کر دینا اُن کا معمولی کرتب ہے لیکن اس بدنصیبی میں خود انسان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انسان بھگوان کی مورت ہے اور خود اپنا بھگوان۔ کچھ ہم بھی اپنا نصیب بناتے اور بگاڑتے ہیں اور ہم سب ملکر۔ یہ سارے دیس دیس کے انسان ملکر۔ یہ انسانیت

کاٹھاٹھیں مارتا ہوا ساگر —— اس ساگر میں خود بھگوان کا روپ جھلکتا ہے مگر شیطان بھی چوری چوری اس آئینہ میں اپنا بھیانک عکس ڈالتا ہے اور ساگر کی اَنگنت لہریں اس نحوست سے گدلا کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتی ہیں۔

گاؤں کے سب کھیت ویران پڑے ہوئے ہانپ رہے تھے، ایک پیاسے بیل کی طرح کسان زمین کی خاطر آسمان سے لو لگائے تھے۔ ہل بیکار پڑے ہوئے کڑھ رہے تھے اور بیل اور دوسرے ڈھور ڈنگر چارہ اور گھاس کی نایابی کے سبب بیمار کتے کی مانند دبلا کر ہڈی ہڈی ہو گئے تھے، پسینے میں ڈوبے ہوئے دن، کھولتی ہوئی دوپہریں، اُمستی ہوئی راتیں۔ ٹوٹی ہوئی امیدوں کی لاشیں اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہوئے تراش گذر جاتی تھیں۔ ہر دن آوارہ بادل کے ٹکڑوں کی بے معنی دوڑ دھوپ سے انگاروں پر لوٹتا تھا۔ پورب کی ہوائیں چلتی تھیں مگر گھٹاؤں کا کوئی پیام اُن کے لبوں پر رقص نہیں کرتا تھا۔ تین مہینے بیت گئے۔ تین تپتے ہوئے افسردہ و آزردہ مہینے۔ کسانوں نے دھان سے نا امید ہو کر مکئی بوئی تھی لیکن یہ فصل بھی کچھ یونہی سی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے کسانوں اور نادار دہقانوں پر تو قیامت ہی گذر رہی تھی۔

ہرنس گوپ ایک معمولی سا کسان تھا۔ بیسا کھ میں لگان ادا کر کے اُس کے پاس موری کا دھان اور جاڑے تک کھانے کیلئے مکئی اور کھساری یہ تین چیزیں رہ گئی تھیں۔ اساڑھ میں دھان کھیتوں میں چھینٹ دیا گیا مگر موری ہری نہ ہوئی۔ جب اُس طرف سے آس ٹوٹی تو اس نے زمیندار سے خوشامد کر کے کچھ بھینٹ کی زمین کڑھے لگان پر لی اور اُس میں ہل جوت کر مکئی کے سونے کے دانے بوئے۔ یہ سونا بھی مٹی میں مل گیا۔ یہیں جتنا بھی چھینٹا گیا تھا اتنا بھی زمین

نے واپس نہ دیا ہوگا۔ اب ہربنس گوپ کے پاس صرف کھساری تھی اور اسی پر سال بھر گذران اور پھر بھگوان جانے پر سال برکھا ہو نہ ہو خیر آنے والے دنوں کے گھپ اندھیرے میں کون جھانکے، لیکن یہاں تو آج کے دن بھی تاریک ہی تھی۔ سورج کی آنکھ شیو جی کی تیسری بھسم کر دینے والی آنکھ کی طرح شعلہ فشاں تھی۔ کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ شمشان کی راکھ کی مانند۔ کھیتوں کی چتا کے ساتھ کسانوں کے ارمان بھسم ہو چکے تھے۔ گاؤں میں سوائے مہاجن اور شیطان کے اور کوئی خوش نہ تھا۔ ہر چہرے پر سکرات کی سی اداسی تھی۔ یہ دھرتی کے سپوت، کسان، یہ کھیتوں کی آبرو، مہا بیر جن کے ہل مٹی سے سونا اگلواتے ہیں۔ بس موسم کی ایک چین جبیں سے ہلاک ہوئے جاتے تھے۔ ان کی شکتی، ان کے بل، ان کے دو بازو کو دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ جو لوگ سات سال کے فراغت سے کھانے کا سامان ایک فصل میں اپجا لیں وہ ایک برسات، محض ایک برسات کے نہ ہونے سے یوں بے آسرا ہو جائیں۔ پر تھا ایسا ہی۔

ہربنس گوپ ایک چھوٹی پونجی کا کسان۔ تھوڑے سے کھیت اس کے خود کاشتہ تھے۔ ان سے اس کے کنبے کا کام کہاں چلتا تھا۔ وہ زمینداروں سے لگان پر بھی کھیت لیا کرتا تھا۔ لگان، مالگذاری اور مہاجن کا قرض۔ سال بہ سال یہ تینوں مطالبات اس کے سر پر سوار رہتے تھے اور اب کے ستم بالائے ستم یہ قاتل خشک سالی! ایک بوڑھا باپ، دو چھوٹے بھائی۔ ایک نوجوان کنواری بہن، بیوی اور بچہ۔ یہ تھا ہربنس کا خاندان۔ ان کے علاوہ بھی اس کے گھر میں اور چند افراد تھے۔ ان کا تعلق بھی اس کنبہ سے بہت گہرا تھا۔ اس رشتہ کا چھور روز تک کنبے کی روح میں دوڑ گیا تھا۔ دہی دکھ سکھ کا تعلق، وہی کڑی محنت میں امداد باہمی۔ خاندان کے یہ جیون

ساتھی ایک گائے اور دو بیل تھے۔

کنبے کے سب لوگ کٹھنائی کا مقابلہ کرنے کیلئے چار و ناچار تیار ہو گئے تھے۔ جانور بھی حالات کو بھانپ لیتے ہیں۔ وُہ بھی سر ڈالے آدھا پیٹ کھا کر جی رہے تھے۔ گائے بچہ دینے والی تھی۔ شاید وُہ آنے والے دنوں کی سوچ میں ہی نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ ہربنس کسی اتھاہ سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ اپنے پڑتی کھیتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ہوک اُٹھتی اور اُس کی مایوس نظروں کے آگے سیہ بختی کے سائے ناچنے لگتے "کا ہوگا" بارہ مہینوں کی لانبی مدّت اور گھر میں صرف چند من کھساری "کا ہوگا؟" یہ سوال ہر آن ہربنس کے سامنے رہتا۔ اتنے دم کھانے والے ..... اور پر سال ملگجاری "لگان" سود کیسے بھرا جائیگا۔ سال بھر کا کھانا۔ کرجا دھار بھی تو ملے کا آس نہیں۔ بھولو کی مائے لڑکوری ہے۔ آدھا پیٹ کھا کر کیسے رہتے ... بھولو بھوکا رہے ہے۔" بھولو کی بھوک کے تصوّر سے ہی گویا ہربنس کی آدھی جان نکل سی جاتی۔" اوس چاٹ کر پیاس کا بجھے۔ لڑکوری جب رات کو اُپاسی رہے ہے تو لڑکا کو دودھ کہاں سے ملے۔" اُس پر دُکھ کا ایک پربت آگرتا اور بیخودی میں اُس کے لب سے تین چار بار "بھولو! بھولو!" نکل جاتا۔

ایک صبح کو رات بھر ڈکرتے ڈکرتے ہربنس کی گائے نے بچّہ دیا جیسے مرے دھان میں پانی پڑ جائے۔ گوپ کے کمہلائے ہوئے چہرے پر شادابی سی آگئی۔ وہ اپنی نیچے چھپر والی تنگ اور اندھیری سی کوٹھری سے انگنائی میں مسکراتا ہوا نکل آیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے گوری بھی تھی۔ بھولو کو گود میں اُٹھائے ہوئے گوری کا چہرہ پکے ہوئے بیر کی طرح گداز اور سُرخ ہو رہا تھا۔ محض ایک سامنے کا آسرا، ایک نیا پیدا ہونے والا سہارا فاقہ زدہ، سوکھے ہوئے چہرے کو حیات کی

بالیدگی سے پُر کر دینے کو کافی تھا۔ دونوں اِس خیال سے خوش و شاداں تھے کہ ان کے بھولو کو دودھ مل سکے گا اور اس کے معصوم کومل لبوں پر گم شدہ تبسّم لوٹ آئیگا۔ نہ جانے دونوں نے بھولو کے اور اپنے متعلق کتنے حسین خواب دیکھ ڈالے ہوں گے، جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ ان کے لئے تھوڑا بھی رُوح و دل کی منجمد گنگوتری کے دھاروں کو جگا دیتا ہے۔ ہربنس نے گئوشال کی کھپریل میں پہنچتے ہی گائے کی پیٹھ تھپ تھپائی اور مارے خوشی کے اس نے پکارا۔

"گوپال! گوپال! ہے رے گوپال! دوڑ کے آ! ہم موتی کو صاف کرے ہیں۔ ننّھے بچہ کو دیکھ..... اِتوار بارے! باچھا ہے گو رے۔ باپو کو جا کے کہہ۔ اِی تیرے بھلوا کا باچھا ہو۔"

اور گائے نے اس خوبصورت تیور سے ہربنس کی طرف دیکھا، جیسے وہ کہہ رہی ہو، یہ ہے میرا بچھڑا۔ اس کے دَم سے میں بھی اس کنبے کی سیوا کر سکوں گی اور جب یہ جوان ہو گا تو تمہارے کھیتوں میں ہل چلائے گا، اُس کی زبانِ بے زبانی، اُس کے مطمئن انداز میں ایک شیریں سا پندار تھا۔ ایک بلند جذبۂ پیشکش۔ موتی سر اٹھا کر بولی ——— "گا ئیں! گھائیں!"

گوری کے دل میں بھی اسی قسم کی ایک آواز اُٹھی۔ گائے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ گوری نے بھولو کو اپنے سینے سے بھینچکر اُسے خوب چوما اور دوڑتی ہوئی اپنی نند کو اٹھانے گھر کے اندر چلی گئی۔ اس کے دل میں کلیاں سی چٹک رہی تھیں۔

"ارے گیندا! اُٹھ نہ! جوانی کی نیند کی ماتی ہے نہ۔"

گوری نے گیندا کو گدگدایا اور خود ہی ہنسنے لگی.....

"اُٹھ! اُٹھ! اب کی جیٹھ میں تیرا گونا کر دیو۔ موتی کو بچھڑا ہوئی ہے لے۔" گیندا ایک

جوان بچھڑی کی مانند دولتیاں مارتی ہوئی آخر اٹھ بیٹھی۔ اُس نے بھر پور انگڑائی لیتے ہوئے مسرت اور متوقع استعجاب سے پوچھا۔

"موتیا کو باچھا ہوئے بھوجی؟ میرے بھولوا کا باچھا۔ میرے بھلوا کا باچھا۔۔۔۔"

گیندا ہرنی کی طرح اچھلتی ہوئی گئوہال کی طرف بھاگی۔ اُس کے دل میں مسرت کا چشمہ اُبل رہا تھا۔ چھوٹے سے پیارے بچھڑے اور اُس کی ماں موتی کو یکجا دیکھ کر گیندا کی روح میں عورت جاگ اُٹھی اور وہ عورت فوراً ماں بن جانے کی خواہش اور سرور سے جھوم سی گئی۔ گوری کی گود سے اُس نے بھولو کو جھپٹ کر چھین لیا اور اُسے بھینچ بھینچ کر پیار پر پیار کرنے لگی ——— "بھولوا رے تیرا باچھا!" گیندا بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہی تھی۔

سوکھے اور تازہ گوبر سے اٹی ہوئی کھپریل میں دو چار پڑوسی بھی آگئے تھے۔ موسم اور زمانہ کے تھپیڑے کھائے ہوئے دیہاتی۔ یہ لوگ ہر بنس کی خوشی میں شریک ہونے آئے تھے اور اُسے طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے۔ گائے بچھڑے اور دودھ کے متعلق پاس پڑوس کی ایک لانبی سی عورت نے ہاتھ میں سیندور لایا اور موتی رانی کی پیشانی میں لگا دیا۔ اس یگانگت میں کیسا رس تھا۔ کاش ہمیشہ ایسا ہی ہوتا! یہ آری کے کٹ جانے ٹنڈ وا سے پانی بہہ جانے اور ذرا ذرا سی بات پر لاٹھیاں بھاجنے، سر پھٹول کرنے اور مقدمہ لڑنے والے کسان جب مل بیٹھتے ہیں تو ان کے پریم میں کیسا خلوص کیسی پاکیزگی ہوتی ہے۔ ان کی محبت پہاڑی جھرنے کی مانند شفاف اور نرمل ہے اور ان کی نفرت چٹانوں کی طرح سخت اور اٹل۔ بدبودار گئوہال میں یہ گاؤں کے بیٹے اور بیٹیاں سڑتے ہوئے گوبر اور اُمنتے ہوئے بھوسے پر اس شان سے براجمان تھے جیسے کانسل کی

مجلس بیٹھی ہو مسئلہ حفظانِ مویشی پر نہایت سنجیدہ اور واقف کارانہ انداز میں رائے زنی اور بحثیں ہو رہی تھیں۔ ان کے وقتی میل ملاپ کے اظہار سے دھرتی کی آشائیں آنکھیں کھول رہی تھیں۔ اس پارلمان میں عورتیں جوان، بوڑھے سبھی شریک تھے۔ غرض ہمسایوں کیا گاؤں بھر کے لئے ایک گائے کا بچہ دینا نہایت اہم اور ہمہ گیر واقعہ تھا۔ اس واقعہ سے کھونٹوں سے بندھے اور ناد میں سانی کھاتے ہوئے بیل بھی متاثر تھے۔

ہربنس کا کنبہ چند ماہ سے کھاری کا گھاٹا یا ستو اور وہ بھی آدھا سو دھا کھا کر بسر کر رہا تھا۔ موتی کے بچہ دینے کے بعد اور تنگی ہو گئی تھی۔ دودھار گائے کی دیکھ بھال ضروری ہے کم از کم ایک ہفتہ تو بچے والی موتی کو دَرّا دینا تھا۔ نہیں تو اس کے سوکھ جانے کا خطرہ تھا۔ ہربنس کل کی امید پر آج سختی سہہ رہا تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد بھینس کا دور ختم ہو جانے پر بگلے کے پروں جیسا سفید دودھ بھولو کے لئے میسر آئے گا۔ یہی آس تھی جو ہمت بندھا کر صعوبت برداشت کرنے کی طاقت بخش رہی تھی۔

رات بھر بھولو روتا رہا۔ گوری، فاقہ مست گوری کو نہ مسور کی دال میسر تھی اور نہ مہنگیہ بلا جیسے آسمان کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ ویسے ہی زمین کی باشی گوری کی چھاتیاں بھی بے رس تھیں۔ ایک روز بھولو کو تھوڑا سا ستو چٹایا گیا تو کئی روز تک اُسے دست آتے رہے۔ اب تو صرف موتی کے دودھ ہی کا آسرا تھا۔ رات بھر گوری اپنے بچے کو بہلاتی رہی لیکن بھوکا بھولو مچلتا، تلملاتا اور روتا ہی رہا۔ ہربنس کی نیند بھی اُچاٹ ہو گئی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ کل صبح سے گائے کا دودھ بھولو کو دیا جائیگا بھینس کے ایک دو روز باقی تھے مگر ایسے کڑے سمے میں کہیں سے دودھ

قرض بھی تو نہیں ملتا تھا اور بھولو، چند ماہ کا ننھا بچہ بھوک سے ایڑیاں رگڑتا رہتا تھا۔

صبح ہو گئی بھولو رفتار و تانڈھال ہو کر سو رہا۔ بیہوشی سی نیند، تھکاوٹ کا ردِ عمل ہربنس نے سویرے اُٹھ کر گائے کو سانی دی۔ اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ اُسے چمکارا اور ٹھری ہیں دودھ دوہنے بیٹھ گیا۔ گوری کی آنکھیں رات بھر کہاں لگی تھیں مگر اس کے باوجود وہ تڑکے اُٹھی اور اُس نے دودھ کی ٹھری کو گوبے سلگا کر سوندھا رکھا۔ ہربنس گھٹنوں کے درمیان ٹھری رکھے ہوئے بڑی یکسوئی سے سر سر دودھ دوہ رہا تھا۔ گوری دہلیز پر کھڑی سُر سُر سُر سُر سُر سُر کی خوشگوار آواز سُن رہی تھی۔ وہ جلدی سے دودھ اونٹ کر اپنے بچے کو پلانا چاہتی تھی۔

"ہربنس گوپ!" اچانک گلی کی طرف سے ایک آواز آئی۔ گوری نے چونک کر اُس جانب دیکھا۔

"براہل جی! . . . بڑا سویرے؟" گوری بولی

"درگہ جی سانجھ کو ڈیوڑھی پر آئے ہیں۔ مہنتھ جی کا حکم ہوا ہے کہ دس سیر دودھ اسامی سب کے یہاں سے ابھی لاؤ۔" پیادہ کاندھے پر تیل پلائی ہوئی پیتل کے مٹھ والی لاٹھی لیتے ہوئے اکڑ کر بولا:۔

ہربنس نے بھی پلٹ کر دیکھا اور پیادہ کی باتیں سُنکر سکتے میں آ گیا۔ گوری کا سر جھک گیا اور اُس کا سارا بدن سنسنانے لگا۔

"براہل جی! ابھی دودھ تو بھینس ہے۔" ہربنس بولا۔

"بات بناتا ہے سالا۔ دودھ کا ہے کو دوہ رہے ہو سالے تب؟" پیادہ ڈپٹا۔

"برا ہل جی! بچّہ کے لئے۔" گوپ نے عذر پیش کیا۔

"سالے بچہ کے لئے، دُودھ جلدی سے سب دودھ! چُرا کے اگر کچھ رکھے ہو تو . . .
مہنتھ جی کا حکم ہے۔ اب ہم وِیدر مارے پھریں؟" ماں، بہن، بیٹی کی گالیاں دیتے ہوئے پیادہ
ہربنس گوپ پر جھڑپتا رہا۔

بنواری سنگھ رام داس مہنتھ کا پیادہ تھا۔ بارہ گاؤں کا زمیندار، وشنوجی کے مندر کا مہنتھ
علاقہ کا سرپنچ۔ رامداس کا ہر طرف طوطی بولتا تھا۔ مذہبی پیشوا اور زمیندار، لئو سبوا کا علمبردار۔ اُس
نے کئی مندر بنوائے تھے اور گئو پالن کی خاطر ایک شاندار گئو شالہ تعمیر کروایا تھا۔

بھلا کِس کی مجال تھی کہ مہنتھ جی کے حکم سے سرتابی کرے مگر بچے کے بھولوکے خیال سے
ہربنس اور گوری نے پیادہ کی بڑی منت سماجت کی لیکن لاحاصل بلکہ اُلٹا اثر اُلٹا ہوا۔

"سالے! تم کو روج ڈیوڑھی کے خرچ کے لئے سب دودھ دینا پڑیگا۔ ایک من دودھ
سے وشنوجی کا چرن دھویا جاتا ہے اور پجاری سب کا خرچہ الگ سمجھیئے سالے؟"

گوری اور ہربنس کی روح فنا ہوگئی۔ ہربنس دودھ دوہتا رہا اور گوری بچے کے رونے اُٹھنے
کی آواز سُن کر اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو بنواری سنگھ ٹہری میں دودھ کے ساتھ
ہربنس کو مہنتھ جی کی ڈیوڑھی پر لئے جا رہا تھا۔ گوری نے رو رو کر بہت فریاد کی لیکن پیادہ
ٹس سے مس نہیں ہوا۔ رونا دھونا تو رعیتوں کا کام ہی ہے۔ ہر قدم پر اگر دل ہی پسیجتا رہے۔
تو پیادہ گری کیسے ہو، رام داس مہنتھ کا حکم کس طرح چلے، وشنوجی کے چرنوں کی سیوا
کیونکر ہو۔ بنواری سنگھ کے لئے اب یہ باتیں پرانی ہو چکی تھیں۔

بچھڑا گائے کے گاڑے ہوئے تھن پر بیتاب ہو ہو کر مُنہ مار رہا تھا۔ آج دودھ کا آخری قطرہ بھی زبردستی دوہ لیا گیا تھا۔ آخر بیقرار ہو کر بچھڑا اچھوڑے ہوئے لیموں کے سے تھن سے علیحدہ ہو کر چلّایا ــــ "ماںںںھ! ماںںںھ!" گائے نے مایوس پھٹی ہوئی آنکھوں سے اپنے بچے کو دیکھا۔ اُن ماتا کی ماری آنکھوں میں انتھاہ، درد اور محبت اُبل رہی تھی۔ گوری کا سینہ بھی شق ہو رہا تھا۔ بھولو بلک رہا تھا۔ بھوکا بھولو اور گوری ایک سوکھے ہوئے مردہ چشمے کی طرح تھی۔ اپنے بھولو کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں گرم گرم آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ دُکھ اور ناکام ماتا کے آنسو۔

دو بے بس مائیں اپنے بھوکے بچوں کو نامرادانہ تک رہی تھیں ✽

جونیئر

وہ جونیئر وکیل تھا اور جونیئر کے معنی ہیں نچلی سیڑھی پر رہنے کے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ترقی کی سیڑھی پکڑے لیٹا ہوا تھا۔ نظریں اوپر اٹھی ہوئی، ہاتھ کانپتے ہوئے اور پاؤں ڈگمگاتے ہوئے۔ سیڑھی کے بالائی ڈنڈوں پر چڑھتے ہوئے سینیئروں کی خاکِ پا کو چار و ناچار وہ سرمۂ چشم بنا رہا تھا اور بہت سے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل سیڑھی کے ارد گرد کھڑے اس کی ٹانگیں کھینچنے کے درپے تھے۔ مگر وہ سیڑھی سے چمٹا ہی رہا۔ کیا کرتا، سب سیڑھیوں کا یہی حال تھا لیکن باوجود سخت کوشش اور ناصیہ فرسائی کے وہ کسی سینیئر سے اپنے آپ کو چپکا نہیں سکا۔ ممکن تھا کہ وہ اس طرح سینیئر کی ٹانگوں سے وابستہ ہو کر اوپر کھنچا چلا جاتا۔ فی الحال تو اسے تن و تنہا ہاتھ پاؤں مارنا تھا۔ ایسا نہ ہو وہ دھب سے نیچے گر کر بھیڑ میں کچلا جائے۔ اس کے ارد گرد، پہلو

بہ پہلو اور بہت سے جونیئر ننھے جو اسی کی طرح لٹکے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور چند سینیئروں کی ٹانگوں سے لگے ہوئے آہستہ اوپر بھی چڑھے جا رہے تھے۔

وہ ایک بوڑھے پیروی کار کا بیٹا اور ایک کھوسٹ جان بلب پنشن یافتہ پیشکار کا پوتا تھا۔ کچہری کے دشت کی سیاحی میں اسکی دو پشتیں گذر چکی تھیں اور پیشۂ آبا کی روایات کو زیادہ چمکاتے ہوئے وہ وکیل بن گیا تھا۔ بوڑھے پیروی کار نے کچہری، اجلاس اور وکالت خانہ کی آغوش میں اَن گنت خواب دیکھے تھے۔ اس کی تمناؤں نے فائلوں، مسلوں اور زرخیز مقدموں کی دُنیا میں پرورش پائی تھی۔ لہٰذا اُس نے اپنی جوانی کے پہلے ثمر کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر وکیل بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ پیروی کار نہایت ہی جُزرس اور کفایت شعار انسان تھا۔ اس نے اپنی کمائی کی کوڑی کوڑی جمع کی اور محض اس اعلیٰ مقصد کے لئے کہ وُہ اپنے نونہال کو کالجوں کی تعلیم کے بعد اجلاسوں پر کبھی پھول برساتا اور کبھی شعلہ فشانی کرتا ہوا دیکھے اور پھر روپوں کی گرم بازاری! پیشکار صاحب کی دولت کے برتے پر وُہ خود پڑھائی سے سبکدوش ہی رہا تھا۔ لیکن ان کی دولت بٹ بٹا کر اسے بس اتنی ملی کہ وُہ زمینداروں کے مقدموں کی پیروی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ گھر کا آٹا گیل نہ ہو۔ جیسے جیسے وُہ راہ ورسم منزل سے باخبر ہوتا گیا۔ اس کے بٹوے کا مُنہ بند ہونے لگا۔ مگر اپنے مقصد کے حصول کے ذریعوں پر اُس نے کافی خرچ کیا۔ بیٹے کی تعلیم کا بوجھ وُہ خوشی سے برداشت کرتا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو ہوسٹل میں رکھ کر آسائش کیساتھ تعلیم دلوائی۔ ہاں فضول خرچی کے خلاف وُہ چھٹیوں میں اکثر وعظ بھی کر دیا کرتا تھا اور خرچ کے حساب پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔

آخر کار بیٹا وکیل بن ہی گیا۔ بڑی مشکل سے اس کی شادی بی۔ اے کرنے تک رُکی رہی۔ ورنہ نسبتیں تو پکے ہوئے بیروں کی طرح ٹپکی پڑتی تھیں بی، اے پاس ہونے کے بعد ہی لڑکوں کے بازار بھاؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کئی لڑکیوں کے باپ تو قانون کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کرنے کو بہ رغبت تیار تھے۔ لیکن پیروی کار تکمیل تمنا کی راہ میں کسی کی دستگیری گوارا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سپوت کو اپنے زور بازو سے وکیل بنانے کا آرزومند تھا۔ سارے جسم کی سوئیاں اُس نے خود نکالی تھیں تو آنکھوں کی سوئیاں کسی دوسرے کو وہ کیوں نکالنے دیتا۔
جب اُس کے بیٹے نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تو ایک پنشن یافتہ ڈپٹی صاحب کے گھر اُس کی شادی کی گئی۔ پیروی کار کو اونچے گھرانوں سے تعلق پیدا کر کے اپنے نام و نمود میں اضافہ کرنے کا خیال بھی تھا۔ لڑکے کو سسرال سے توقع سے کم روپے ملے مگر اثاثہ کافی ملا۔ نئی وضع کا سنگاردان جس میں جدید تراش کے حلبی آئینے جڑے ہوئے تھے۔ شاندار مسہری، میز، کرسیاں اور ڈرائنگ روم کا اچھا سا سٹ۔ برتن باسن بھی خاصی تعداد میں اور سب سلیقے کے۔ ریڈیو کا خیال تھا مگر اس سے بہتر سنگر مشین سمجھی گئی۔ غرض بڑی اچھی شادی ہوئی۔ باپ، بیٹا، عزیز رشتہ دار سب خوش تھے۔ پیروی کار نے سمدھیانے کے روپوں کو جمع کرا دیا مگر جلد ہی قانون کی گراں قیمت کتابوں اور نظیروں کی خرید کے لئے ان کی ضرورت پڑی۔ بڑے حوصلے سے وکالت شروع کی گئی تھی۔

ہر چند کہ کسی سینئر کے ماتحت رہ کر، کام کرنے کا فخر نو خیز وکیل کو حاصل نہ ہو سکا پنشن یافتہ ڈپٹی صاحب نے بھی داماد کی خاطر اپنے گذشتہ اثر و رسوخ کو بر سر کار لانیکی کوشش

کی مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ہر سینیئر صاف انکار تو کرتا نہیں تھا۔ مگر وابستہ داماں جونیروں کی بھیڑ بھاڑ جتلا کر عذر کر دیا تھا۔ تاہم نوخیز وکیل نے بڑی امیدوں کے ساتھ تن و تنہا اپنے پیشے کی ابتدا کر دی۔ ہاں خرانٹ وکیلوں کے در دولت پر سلام کرنے وہ اکثر حاضر ہو جایا کرتا تھا ایک کارواں تائید کی خدمتیں بھی حاصل کر لی گئیں اور اس کے بعد باپ بیٹا دونوں ہوائی محلوں کی تعمیر میں مشغول ہو گئے۔

نوخیز وکیل اپنے آفس میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھتا۔ سامنے سکریٹریٹ ٹیبل پر خوبصورت چمکتی ہوئی شیشے کی دستی، سلور کا صاف سا کیلنڈر، نفیس و رنگین پیپر ویٹ، سادے کاغذوں سے بھری ہوئی فلیٹ فائلیں، ونتین پر بے داغ جاذب، سلیقے سے رکھے ہوئے دو فاؤنٹن پن اور آبنوسی بک کیس میں موٹی موٹی قانونی کتابوں کے ہم پہلو رسکن، کار لائل، میکالے اور برک کے شاہکار رہتے۔ کرسی پر پہلو بدلتے بدلتے وکیل اپنے پاؤں میز پر رکھ کر پھیل جاتا۔ میز گھڑی ٹک ٹک، ٹک ٹک کرتی رہتی۔ شاندار الماریوں میں سنہرے حروف سے مزین رعب ڈالنے والی کتابیں فوجی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب وار لائنوں میں آراستہ نظر آئیں جیسے کوئی فوجی دستہ چمکتے ہوئے لباس اور اسلحوں کے ساتھ "اٹنشن" کی حالت میں ہو۔ اس کے دماغ میں خیالات مارچ کرتے ہوئے آتے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وُہ خود خیالات کی پلٹنوں کو منظم کرتا، انہیں ساری دُنیا کی فتح کے لئے روانہ کر دیتا اور فاتح جرنیل کی طرح فتوحات کے نشہ سے سرشار ہو جاتا۔ اس کا کمرہ عموماً خالی ہی رہتا تھا۔ خیالات میں کوئی شے حائل نہیں ہوتی یہ تصورات کبھی اس درجہ حقیقی بن جاتے کہ نوجوان وکیل خیال ہی خیال میں

تقریر و بحث کرتے ہوئے واقعی بلند آواز میں سرگرم ہو جاتا ——

"می لارڈ بات یوں ہے کہ حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ صداقت چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہے۔ ظلم کی سیاہی الفاظ سے نہیں دھوئی جا سکتی۔ مرڈر مسٹ اسپیک شیکسپیئر کا بھی خیال تھا کون شیکسپیئر؟ وہ جو فطرتِ انسانی کا رازداں تھا کہ خونِ ناحق چھپائے چھپ نہیں سکتا۔ ایک شاعر نے کہا ہے۔ اور می لارڈ! شاعر نباضِ حیات ہوتا ہے۔ ع

"جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا"

"جی حضور کیا حکم ہے؟" تائید نے کمرے میں آ کے گھبرا کے پوچھا۔

"می لارڈ! میں آج ثابت کر دوں گا کہ میرے مؤکل کے بیٹے کا ناحق خون کیا گیا۔ یہ بھائی خود ایک زبردست شہادت ہے!" وکیل نے میز پر مکا مارا

"حضور کا مزاج کیسا ہے؟" تائید نے چیخ کر کہا۔

نوجوان وکیل چونک اٹھا اور صورتِ حال کو سمجھ کر شرمندہ ہوا۔ "کچھ نہیں! یونہی ہیں ایک کتاب کی عبارت کو زور زور سے پڑھ رہا تھا!"

ایسے واقعات تائید کے علاوہ کئی بار خدمتگاروں کے ساتھ بھی پیش آئے۔ غرض گھر ... اسی طرح گزرتی۔ دس بجے دن کو کچہری جانا ہوتا۔ اس کا اہتمام ۹ بجے سے ہی شروع ہو جاتا۔ جونیئر وکیل گھر ہی سے سیاہ قبا پہن کر روانہ ہوتا۔ اسے پہنتے وقت وہ ایسا محسوس کرتا کہ یہ کوئی جادو کا جبہ ہے جسے پہنتے ہی وہ ترقی کی فضا میں پرواز کرنے لگے گا مگر وکالت خانہ پہنچتے ہی اس کے پر سمٹ جاتے تصورات کا غبارہ پچک جاتا اور وہ کھنچا کھنچا بکھرے ہوئے کمرے

میں محض ایک جونیئر وکیل نظر آتا۔ ہر میز پہ بھانت بھانت کے وکیلوں کے پرے کے پرے ہوتے۔ کچہری کا شور و ہنگامہ اور کس مپرسی بھی رعب ڈالنے والی چیزیں تھیں۔ وہ اس سمندر میں ایک قطرۂ ناچیز تھا۔ حجاب کے پسینے میں اس کی انفرادیت ڈوب جاتی۔ وہ کسی گوشے میں ایک کرسی پر اپنی جگہ بنا لیتا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی جائزہ لینے والی نظریں اس سے ہٹ جاتیں اور وہ اطمینان کی سانس لیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگوں کو اس کی ہستی کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ اس سے اسے ایک گونہ تکلیف پہنچتی۔ وہ خیالات میں غرق ہو جاتا۔ اس مایوسی کی ٹھوکر سے اس کی شخصیت پھر ابھرنے لگتی۔ وہ سوچتا۔ وہ دن بھی آنے والا ہے۔ جب سارے وکلا کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی پیچھے پڑیں گے۔ ہر جگہ میرا طوطی بولے گا۔ ہر اجلاس پر میری دھوم مچ جائیگی۔ وہ اسی طرح سوچتا جاتا تا آنکہ شام ہو جاتی اور وہ اپنے تائید کے ہمراہ گھر لوٹ جاتا۔ رات کو وہ اپنے آفس میں بیٹھا قانون کی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتا اور زریں مستقبل کے خواب۔

پیر دہی کار اپنے بیٹے کا ذکر اب اس کا نام لے کر نہیں کرتا بلکہ ہر موقع پر "وکیل صاحب" کہہ کر اسے یاد کرتا۔ وہ اکثر وکیل صاحب کا تذکرہ کرتا رہتا۔ عزیزوں سے دوستوں سے ان سے اُن سے بے سبب۔ اس طرح اس کے پندار کو تسکین ہوتی۔ وہ خواہ مخواہ بے بات کی بات میں بھی اپنے بیٹے کے ذکر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتا۔ مقدموں کی بات ہو تو خیر بے جوڑ گفتگو کے موقع پر بھی "وکیل صاحب" تشریف لے آتے تھے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل کے بارے میں بھی اگر بول چال ہو تو "وکیل صاحب" درمیان کلام میں یوں نکل آتے کہ: ٹائم ٹیبل۔ ہاں ٹائم ٹیبل۔ وکیل صاحب جب کالج میں پڑھتے تھے تو انہیں ٹائم ٹیبل کا زیادہ حصہ زبانی یاد ہوتا تھا۔ شروع

ہی سے یہ ذہین اور ہوشیار ہیں"۔ یا یوں ——— "بھائی سفر میں آرام کہاں! ہاں سکنڈ فرسٹ کلاس میں تھوڑا بہت آرام مل جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے وکیل صاحب جب سفر کرتے ہیں سکنڈ کلاس میں ہی کرتے ہیں"۔ پیروی کار نے معقول طریقوں سے بھی اپنے بیٹے کا پروپیگنڈا کرایا۔ کچہری کے دلالوں سے اس کی پرانی ملاقات تھی۔ وہ وکالت کے پیشے کے سارے ہتھکنڈے جانتا تھا۔ اس نے خوب تگ ودو کی اور آئندہ ترقی کی آس لگائے صبر سے انتظار بھی کرتا رہا مگر وکیلوں کی تعداد ہی اتنی زیادہ ہو چکی تھی۔ کہ حق ناحق کے مقدمے کہاں سے اتنے آئیں کہ سب کی وکالت چمکے۔ انتظار کی مدت بہت طویل ہوتی جا رہی تھی۔ تاہم باپ بیٹے دونوں بڑی بڑی امیدوں کے چراغ جلا رہے تھے۔

اب کچھ مؤکل جونیئر وکیل کو ملنے لگے۔ وہ دن اس کے لئے عید کا دن تھا جب پہلی بار دلال کی کوششوں سے اُسے ایک چھوٹا موٹا کام ملا۔ تاریخ بڑھانے کی درخواست پیش کرنے کو اُسے اجلاس پر حاضر ہونا تھا۔ جونیئر جوشِ مسرت میں گھبراہٹ اور حجاب کے اثرات سے بھی محفوظ رہا۔ اس پر ولولہ اور امنگ کا جذبہ طاری تھا۔ آج وہ اپنے کو صحیح معنوں میں وکیل محسوس کر رہا تھا۔ وہ پہلی ہی جست میں گویا مینار ترقی پر چڑھ گیا تھا۔ دنیا اور اُس کے بسنے والے اُسے حقیر نظر آ رہے تھے، حاکم کرسی پر بیٹھا تو اُسے ایک ادنیٰ خادم معلوم ہو رہا تھا جس کا بس اتنا کام ہے کہ اُس کے حکم کی تعمیل کرے۔ اجلاس سے باہر آکر اُسے فیس کے دو روپے ملے وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ دو روپوں کی حقیقت کیا تھی۔ وہ اس نادر تجربے کی سرمستیوں میں غرق تھا۔ نہایت ہی لاپروائی سے اُس نے دونوں روپے جیب میں ڈال لئے۔

"حضور! میری خدمت کا معاوضہ" دلال نے کہا۔

وکیل نے جھٹ سے ایک روپیہ نکال کر دلال کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور مسکراتا ہوا وکالت خانہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں وہ ایک فاتح کی طرح داخل ہوا اور سارے وکیلوں کو نظر انداز کرتا ہوا ایک محفوظ گوشہ میں جا کر بیٹھ رہا۔ بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنی بہت سے دیکھے ہوئے خواب پھر دیکھے اور کچھ نئے خواب بھی۔ اُس نے اپنی سرشار شباب بیوی کو دیکھا۔ اسکے پازیب کی جھنکار سنی۔ اس کی مسکراہٹوں کو شفقِ رنگین کی طرح پھیلتے ہوئے دیکھا۔ اُسنے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اُس پر فخر کر رہی ہے اور اُس کے جوشِ ستائش کی شدت کا اظہار ایک والہانہ سپردگی کی کیفیت سے ہو رہا ہے۔ نوجوان وکیل بہت دیر تک جاگتے ہوئے سپنوں کے رنگ برنگ جالے بنتا رہا۔ تائید کی آواز نے اس کے سپنوں کے پرندوں کو خیال و تصور کے رنگین جزیروں کی طرف اڑ جانے پر مجبور کر دیا اور وہ جوشِ انبساط میں ڈوبا ہوا گھر لوٹا۔

بوڑھا پیرو کار بھی باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس کا بیٹا ترقی کی پہلی سیڑھی پر چڑھ گیا تھا۔ اُس کے خواب حقیقت بننے والے ہی تھے۔ اس خوشی میں اُس نے بیٹے کی تحریک پر بہو کو اُس کے میکے سے اپنے گھر بلوا لیا۔ نوجوان وکیل کے دل میں بہار آگئی۔ اُسے زندگی کا ہر لمحہ بامعنی معلوم ہوتا تھا۔ اب اس کا پیشہ اس کے لئے نئے ممکنات اور نئی مسرتوں کا حامل تھا۔ اپنی چھوٹی سی زندگی خود بنانی، اپنی دنیا کو آپ سجانا، کسی پیاری ہستی کیلئے جہدِ حیات میں مشغول ہو جانا پُر قوت بازو اور ارمان سے بھرا ہوا دل رکھنے والے ایک نوجوان کے لئے حاصلِ حیات ہے۔ جونیئر وکیل مستقبل پر نظر جمائے آہستہ خرام حال میں متوقع کامرانی کا انتظار

کر رہا تھا۔ ہجوم انبساط میں وہ تھوڑی سی بیزاری بھی محسوس کرتا تھا۔ اپنی نازپروردہ بیوی کے لئے وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کام اُسے اِکّا دُکّا ہی ملتا تھا اور جو فیس بھی اُسے ملتی وہ بیوی کا رہ کے اِس مشورے کی نذر ہو جاتی۔ "بیٹیا! ہائی کورٹ میں نام درج کرانے کی فیس کے لئے روپے جمع کرو۔"

اس کی بیوی کے نجی خرچ کے لئے اس کے میکے سے روپے آجاتے تھے۔ وہ ابھی غیر رومانی مسئلوں کے سلسلے میں اپنے شوہر سے گھلی ملی نہ تھی۔ مگر نوجوان وکیل جب سنگار دان پر "عمرِ خیام" "آئی سلما کریم" "ہزلین سنو" "کیلی فورنین پاپی" وغیرہ آراستہ دیکھتا تو اس کے دل پر ایک ہلکی سی موہوم چوٹ لگتی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ سب چیزیں اس کی دی ہوئی ہوتیں۔ اُسے وہم ہونے لگتا کہ اس کی بیوی کی حسین نگاہوں میں اُس کے شکست پندار کے لئے کچھ ضربیں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کے بہت سے عشرت بہ آغوش لمحات میں اسی نوع کے احساسات نے تلخی کی آمیزش کی تھی۔

اس کا نام ہائی کورٹ میں بھی درج ہو گیا۔ لیکن اب تک کام کا وہی عالم تھا۔ زیادہ تر ایسے لوگ جونیر وکیل کی طرف رجوع کرتے جو کچہری کے چھوٹے موٹے کاموں پر کچھ بھی رقم خرچ کرنی نہیں چاہتے تھے۔ کوئی تھوڑا سا بھی جانا پہچانا موکل یوں تمہید شروع کرتا... "آپ کے سسر اور میرے چچا سے دانت کاٹی دوستی۔ ہم نوالہ اور ہم پیالہ۔ کیا وہ زمانہ تھا! اب ایسے لوگ کہاں جو دوستی کا خیال رکھتے ہوں! مگر جناب ڈپٹی صاحب بڑے وضع دار آدمی ہیں......"

"آپکے نانا صاحب اور میرے دادا اپنے ممیرے پھوپھیرے بھائی تھے" کوئی شجرہ نسب سے
ابتدا کرنا۔ اور سب کی انتہا یہ ہوتی کہ "آپ مجھ سے نہیں کیا لیجئے گا" اور وہ بھی مافی الضمیر۔ جونیئر
وکیل کچھ تو شہرت حاصل کرنے کے لئے اور کچھ مروّت سے مفت ہیں کام کر دیتا اور یارانِ ہوشیار
اس انداز سے رخصت ہوتے کہ انہوں نے ہی وکیل سے کام لے کر اُس کی عزت افزائی کی ہے

زمانہ اسی طرح گذرتا رہا کہ مہینے میں دس پندرہ روپوں سے زیادہ جونیئر وکیل کو نہیں ملے اور وہ
بھی اِس بُرے حال سے کہ کوئی مقدمہ باز کسی دلال کی سفارش سے اِس پر عنایت کر دیتا
وکالت خانے میں وہ روز اپنی دوکان لگاتا مگر کوئی خریدار قسمتوں سے ہی اسطرف بھٹک
کر آنکلتا۔ جیسے کوئی طیارہ دھم سے زمین پر آرہے اسی طرح نوجوان وکیل کی آرزوئیں پر شکستہ
ہو کر تلخ حقیقتوں کے دلدل میں آگری تھیں۔ بوڑھا پیروی کار اس ناکامیابی کا ذمہ دار اپنے
بیٹے کو سمجھنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کے خیال میں بیٹے کی نااہلیت مسلّم ہو گئی۔ بوڑھے پیروی کار کے
لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ بعض دفعہ ردِّ عمل بھی عجیب طرح ہوتا ہے۔ وہ مقصدِ حیات میں ناکامیاب
ہو کر اُس ہستی سے ہی برگشتہ ہو گیا جس سے وہ مقصد وابستہ تھا۔ پیروی کار کی منطق بہت سادہ
تھی۔ زندگی میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور ناکامیابی اُنکا حصہ
ہے جو نااہل ہیں۔ کامیابی کے فورمولا پر اس کا بیٹا پورا نہ اترا اور اس کے ارمان و تمنا کے خواب
کاتک کے بن برسے ہوئے بادل کے ٹکڑوں کی طرح تتر بتر ہو گئے۔ پیروی کار بیٹے سے برگشتہ ہوتا
گیا اور اسی تناسب سے اُس کے بٹوے کی باچھیں تنگ ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ پیروی کار از حد
سخت گیر اور کوتاہ دست ہو گیا۔ ویسے بھی وہ کم مایہ آدمی تھا اور اب اُس نے اپنی کھوپڑی

بہت پونجی سختی کے ساتھ بچانی چاہی۔ پھر سب پر طرہ اس کا چڑچڑا پن۔ نوجوان مگر ناکامیاب وکیل حوصلہ شکن بیزاری کے عالم میں زندگی بسر کر رہا تھا۔

جونیئر وکیل نے اپنی جدوجہد میں اضافہ کر دیا۔ تاہم نتیجہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ محض ایک جونیئر وکیل تھا اور جونیئر کے معنی ہیں نچلی سیڑھی پر ہونے کے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ترقی کی سیڑھی پکڑے لٹکا ہوا تھا۔ نظریں اوپر اٹھی ہوئی، ہاتھ کانپتے اور پاؤں ڈگمگاتے ہوئے۔ بے یار و مددگار، پیشہ ورانہ رقابتوں کا شکار، مگر وہ سیڑھی سے چمٹا ہی رہا کیا کرتا سب سیڑھیوں کا یہی حال تھا!

وہ ابھی ناکامیابی کی اس منزل پر نہیں پہنچا تھا جہاں بے حسی میں نجات ملتی ہے۔ اس کا زخم ہنوز ناسور نہیں ہوا تھا۔ اس کا احساس سب سے زیادہ اپنی بیوی کے سامنے بیدار ہوتا اسے بیوی سے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ہر چند کہ اس کی راتیں اپنی شریک حیات کی معیت ہی میں گذرتیں لیکن وہ ایسا کھویا کھویا سا رہتا جیسے وہ قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہے۔ اس کے لئے بیوی اس کی ناکامیابی کا آئینہ تھی، اس کی ناکامیابی سے بے خبر۔ اس کے پاس جب بھی وہ ہوتا وہ محسوس کرتا کہ کوئی کہہ رہا ہے: "تم نے ناحق شادی کی۔ تم بھی کیا مرد ہو! نکھٹو، بیکار" اور غریب بیوی مایوس، مضمحل، دل شکستہ تھی۔ اب اس کا سنگار دان ویران تھا۔ اس کا آئینہ اداس اس کی مسہری بے کیف۔

ایک دن نوجوان وکیل اپنے ویران آفس کی تنہائی سے گھبرا اٹھا کچہری جانے سے پہلے زنانخانے میں جا نکلا اور چہرے پر نقلی شگفتگی کا غازہ مل کر بیوی کے پاس گیا۔ بیوی پھٹی

ہوئی جاور کو مشین پر سی رہی تھی۔

"کیسے اِس وقت اِدھر آ نکلے؟" بیوی نے فوراً کام بند کرتے ہوئے مسرت سے دریافت کیا۔ اس کے لہجے میں ایک دردمندانہ طنز بھی تھا۔ "میں دیکھنے آیا تھا تم کیا کر رہی ہو۔" یونہی"

وہ نہیں جانتا تھا کہ جواب دے رہا ہے۔

"آپ تو ہر وقت مشغول رہتے ہیں جب گھر آتے بھی ہیں تو کھوئے ہوئے سے ہر وقت مقدموں کی ہی فکر۔ دلیلیں سوچتے رہتے ہونگے۔ ایسی بھی کیا کام کی دھن!" بیوی نے شوہر کو غیر معمولی طور پر خوش دیکھ کر محبت سے نگاہ کیا۔ وہ کیا جانتی تھی کہ یہ خوشی محض ایک عارضی پناہ ہے

"ہاں ٹھیک مقدموں کی فکر۔ مقدمے کچہری! ہاں مگر تمہیں تو خوش رہنا چاہیئے تم کیوں سست رہتی ہو۔ میں نے تمہیں خوش نہیں رکھا . . . میں . . . میں . . ." وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر چپ ہو گیا اور اُس کی نقلی مسرت شام کی آخری دھوپ کی طرح جو دیوار دور سے اچانک غائب ہو جاتی ہے روپوش ہو گئی۔ اس کا ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر اب تک سایے کسی سے منڈلا رہا تھا۔

"آج کل نمائش آئی ہوئی ہے۔ شام کو چلیئے نہ وہاں دو گھڑی کے لیئے دل بہل جائیگا۔ آپ بھی کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔" بیوی نے شوہر کی افسردگی کو دور کرنے کے لیئے کہا۔

"اچھا تم چلی جانا اگر بلبشیں۔ تم کہیں جاتی واتی بھی تو نہیں۔" شوہر نے بیوی کی دلدہی کی۔

"کوئی لے جانے والا بھی تو ہو!" بیوی نے شکایت کو تیکھا بناتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوب! میں آج تمہیں لے چلوں گا۔"

جونیر وکیل نے دھڑلے میں جواب دے دیا تھا۔ اس جواب کے مطالبات اس پر اس طرح واضح ہوئے جیسے موت یاد آ جائے۔

دس بجے وکیل کچہری روانہ ہوا۔ آج اس کی ناکامیابی کی ساری اَلم سامانیاں اس پر اس طرح برس رہی تھیں۔ جیسے کوئی سنگسار کیا جا رہا ہو۔ سڑک پر کے روڑے اس کے جذبات میں گڑ رہے تھے۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ ٹم ٹم، گاڑیاں، موٹریں اسکے سینے پر چل رہی ہیں راہ گیر اُسے منڈلاتے ہوئے بھوتوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے چہرل سے اُسے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر شے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ اپنے کندھوں پر ہوا کا بوجھ تک محسوس کر رہا تھا کبھی اس کا دماغ خیالات سے بری ہو جاتا بحیثیر معطل۔ اور کبھی خیالات اس طرح ہجوم کر کے آتے جیسے کسی تنگ گلی سے بہت سے بلوائی گزر رہے ہوں "نمائش" یہ لفظ اس کے لئے پیام مرگ تھا۔ اسکی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ گھر پر ایک دھیلا نہیں اور کچہری سے کوئی امید نہیں۔ جونیر وکیل چلا جا رہا تھا، مایوس، بیزار، اداس، بازار میں اس نے ایک بندر نچانے والے کو دیکھا۔ اس نے سوچا، "کاش میں وکیل کی جگہ ایک قلندر ہی ہوتا۔ بندر تک ہوتا بھی ناکامیاب وکیل ہوتے سے بہتر ہے۔" اس نے ایسا محسوس کیا کہ نمائش گاہ بندروں کے ناچ کا بہت بڑا اکھاڑا ہے۔ اور وہ اس میں ناچنے والا ایک بڑا سا بندر۔ "ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ" بندر والے نے ڈگڈگی بجائی۔ سڑک پر کھیلتے بھونکے لڑکوں نے شور مچایا، جونیر وکیل کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ اسکا دل ناچنے کو چاہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجنونانہ ہنسی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ ایک زور کا قہقہہ لگاتے لگاتے محض اس لئے بچا کہ اس کی توجہ دوسری طرف پھر گئی ــــــ "ہمالیہ کی جڑی بوٹیوں

سے بنائی ہوئی دوا ہے۔ بارہ برس گنگوتری اور بارہ برس نندا دیوی کی۔ برفانی گپھاؤں میں ایک سادھو مہاتما نے جوگ، سادھنا تپ رشی کھیش میں اُسے آکاش بانی ہوئی۔ یہ دوائی انہیں سادھو مہاتما کے چرنوں کی سیوا سے ملی ہے۔ بھائی لوگ غور سے سنیں! مرگی، بواسیر، کنٹھ مالا، سوزاک، گرمی، کوڑھ، پرانا بخار، کالا آزار، ہیضہ، چیچک، پلیگ، باؤ گولا، زخم ناسور، سانپ کا کاٹا، بچھو کا ڈنک، پرسوت کی بیماری، کمر کا درد، گٹھیا، کون سا روگ ایسا ہے جس کا یہ علاج نہیں۔ بھائی لوگ! فائدہ نہیں ہونے سے پیسہ واپس۔ اور بغیر وشواش کے کچھ لابھ نہیں . . . "وکیل کچہری کے احاطہ میں داخل ہوا تھا۔ پیپل کے درخت کے نیچے ایک سڑک حکیم مسلسل ڈاکٹر گوئبلز کی طرح پروپیگنڈا کر رہا تھا۔ اسکے چاروں طرف ایک خلقت حلقہ باندھے کھڑی تھی۔ وکیل بھی غیر ارادی طور پر وہاں کچھ دیر کیلئے کھڑا ہو گیا۔ جب سڑک حکیم کی تقریر ختم ہوئی تو حلقہ سے نکل کر ایک شخص نے یہ کہتے ہوئے کہ ایک ہفتہ ہوا کہ اس نے دوا لی تھی جس سے بہت فائدہ ہوا، مزید دوا خریدی۔ پھر تو دھڑا دھڑ پیسے برسنے لگے۔ جونیئر وکیل کے منہ میں پانی آگیا۔ کاش وہ بھی سڑک حکیم ہوتا۔ یہ سوچ کر وہ اتھاہ مایوسی کے تاریک کنوئیں میں ڈوب گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور اس اندھیرے میں "نمائش" کا لفظ اُسے سانپ کی طرح گھور رہا تھا۔

"اجی وکیل صاحب! کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟" ایک لال کی آواز سے وکیل چونکا۔ اُسے حجاب کا پسینہ آگیا۔

"کچہری ہی آرہا ہوں۔ ذرا یونہی کھڑا ہو گیا۔ ان فریبیوں کو دیکھو۔ گنواروں کو کیسا ٹھگتے ہیں..."

وکیل مسلسل اپنے دل کا بخار سڑک حکیموں کے خلاف نکالتا رہا۔ ناکامیاب کامیاب سے عموماً جلتے ہیں۔

وکیل نے روز دلال کی بہت خوشامدیں کیں۔ اتنی کہ گرگِ باراں دیدہ موٹے چمڑے والے دلال کا دل بھی پسیج گیا۔

سہ پہر بھی ڈھل چکی تھی۔ کچہری کا شور و ہنگامہ کم ہو رہا تھا، پیپل کے درختوں کے نیچے کی آبادی گھٹ رہی تھی "اب حاضر ہو؟" کی آوازیں بھی معدوم تھیں اور سڑکوں کی دھول کل تک کے لئے آرام لینے نیچے بیٹھ رہی تھی۔ جونیئر وکیل وکالت خانہ کے برآمدہ پر ٹہلتے ٹہلتے جب تھک گیا تو کچہری کے احاطہ میں یوں ٹہلنے لگا جیسے کوئی غریب بھوکا اور در در کا ٹھکرایا ہوا کتا اپنی دُم سکڑائے سر جھکائے ہوئے چلتا ہے۔ سامنے سے دلال ایک نوجوان کو لئے آتا دکھائی دیا۔ جونیئر وکیل اس طرف لپکا جیسے کوڑے کے ٹین کی طرف گرسنہ کتا لپکتا ہے۔

"کیا ہے بھائی نجابت! کوئی کام لائے ہوئے" وکیل نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "ہاں وکیل صاحب یہ حضرت اپنی سند کھو بیٹھے ہیں۔ بی۔ اے کی شاید۔ اب نوکری میں درخواست دے رہے ہیں۔ یونیورسٹی سے سند لینے کے لئے "آفی ڈیوٹ" کرانا ہے۔ بس آپ جانئے اور یہ" دلال یہ کہکر چلا گیا۔

چلئے وکیل صاحب سکھدیو بابو ڈپٹی مجسٹریٹ کے اجلاس پر آفی ڈیوٹ کرا دیجئے یہ رہی آپ کی فیس" موکل نے چونی وکیل کی طرف بڑھائی۔ وکیل مبہوت رہ گیا۔ اور وہ مجسم احساسِ درد تھا۔

"اجی وکیل صاحب جلدی! اجلاس اٹھ نہ جائے . . . . . میں مختار صاحب سے اب تک کرا لیتا آفی ڈیوٹ۔ میاں نجابت مجھے یہاں لے آئے۔ چونی پر بہتیرے راضی ہیں۔ آپ کو کیوں تردد ہے؟ آیئے چلئے!" موکل کو بس اپنے کام کی عجلت تھی۔ وکیل کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ کہ

وہ اتنا نیچے اتر رہا تھا کہ اُس کی شخصیت لرز اُٹھی مگر حقائق کے مطالبہ کے سامنے اُسے جھکنا پڑا
اس کے دماغ میں بہت سے خیالات آئے۔ اُس کے دل میں بہت سے احساسات نے نشتر
لگائے۔ آخر شش سنجیدہ صورت منطق نے اُس کی دستگیری کی: "کم از کم نمائش جانے اور وہاں سے
واپس آنے کے لیے رکشا کے کرائے تو بچ جائیں گے۔" یہ سوچ کر جونیئر وکیل موکل کو لیکر اجلاس
پہ آتی ڈیوٹ کرانے چلا گیا اور چونّی اس کی جیب میں اکلوتے بچّے کی طرح پہ اپنی بنی ہوئی آرام
کر رہی تھی ۔

تاخیر

وہ نسلاً ہندوستانی مسلمان، سیرتاً عہدِ حاضر کے نوجوان اور عادتاً اینگلو انڈین تھے مگر ورثۃً سیرت اور عادت کے امتزاج سے ایک استوار شخصیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ترکیبِ شخصیت کے نامکمل ہونے کے سبب ڈاکٹر کریمی سے زیادہ تر ایسی حرکتیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ ابھی وہ اچھے خاصے بھلے مانس ہیں اور ابھی دست بہ سینہ نظر بر لب ہائے تبسم کے روحانی اور پھر گھڑی بھر میں تکلیف دہ نوعیت کے پلیبی صاحب۔

خود ڈاکٹر کریمی کے لئے ان کی سیرت بلائے جان تھی۔ میڈیکل کالج کے شفاخانے میں وہ ہاؤس مین تھے۔ ڈاکٹری کی ڈگری لے کر وہ اسپتال کے وارڈوں سے ایک سال کے لئے تجربے

حاصل کرنے کی غرض سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹری ملازمتوں کا عنقا ہونا اور ڈسپنسری کھول بیٹھنے کے لئے روپوں کی نایابی بھی عموماً ایسے تجربوں کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر کریمی تجربے حاصل کر رہے تھے۔ ان کے افسر تو ان سے ایک گونہ خوش تھے۔ پر کبھی کبھی یہ حضرت ذرا بے موقعہ حالتوں اور دلچسپ کیفیتوں میں پکڑ لئے گئے تھے۔ یہ تو عہدِ حاضر کی زرّین رواداری کا صدقہ تھا کہ اس کے سہارے کریمی بچ نکلا کئے۔ اسی اصول کے طفیل اور بھی بیمِ موج و گرداب سے کھیلنے والوں کی کشتی سبکساری ساحل حاصل کرتی رہتی تھی۔ کریمی کی سلامتی کوئی انوکھی سلامتی تو تھی نہیں کہ وہ پھر شبِ تاریک سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ وہ ہندوستانی نرسوں کے دراز گیسوؤں سے کھیلتے تھے اور اینگلو انڈین نرسوں کی "زلفِ مختصر" کے لئے ترستے رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ چشمِ ازرق کے بسمل تھے۔ کریمی مریضوں اور ماتحتوں کیلئے بالکل صاحب تھے بلکہ عرش نشینی میں اُن سے کئی آسمان اونچے۔ اپنے کردار کی نااستواری کے سبب کبھی وہ گرم رہتے اور کبھی نرم۔ یہ نرمی اور گرمی یوں تو ان کے لئے عام طور پر ابھی چنداں نقصان رساں نہ تھی لیکن جب یہ افتادِ طبع عملی زمان کے میدان میں جلوہ گر ہوتی تو ڈاکٹر کریمی ایک مضحکہ انگیز چیز بن کر رہ جاتے۔ سفید فام نرسوں کی لطیف چالوں کے وہ بہت جلد شکار ہو جاتے تھے اور ان کی رہزنانِ تمکین و ہوش اداؤں کی یلغار کے سامنے بالکل بودے نظر آتے۔ یہی کیفیت کریمی کے لئے بلائے جاں بنی ہوئی تھی۔

ایک دفعہ کریمی اسٹاف مارتھا کے متعلق مغالطے میں مبتلا ہو گئے۔ مارتھا کی عمر چالیس سے بالا ہی ہوگی۔ مگر چاق و چوبند رہنا جوانی کی شباہت کا ایک حد تک ضامن ہو جاتا ہے۔ مارتھا نوجوان شکاری سے باز آچکی تھی۔ ڈاکٹر کریمی سے اس کی ملاطفت محض طبیعت کی نیکی کی بنا پر تھی۔

ہوسکتا ہے کہ جذبۂ مادری کے وفور کا ایک ہلکا سا پرتو بھی اسکے ساتھ شامل ہو۔ بس اسی ملاطفت سے کریمی نے ذہنی طور پر بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ وہ سمجھے کہ عین خوش نصیبی سے ایک سفید پری نے انہیں گلفام بنالیا ہے۔ آخرش ایک رومان خیز شام کو انہوں نے اظہارِ تمنا کر ہی دیا . . . .

ڈاکٹر کریمی! میری ایک لڑکی 'کانونٹ' میں پڑھتی ہے۔ میں تمہیں اس کا نام بتاتی ہوں وہ تمہاری بے قرار آرزوؤں کے لئے زیادہ موزوں ہوگی . . . "

یہ اسٹاف مارتھا کا حماقت شکن جواب مگر کریمی یہ سمجھے کہ ایک نشانے میں دو شکار گرے اس واقعہ کے بعد زمانہ تک حضرت نرسوں کے درمیان اُلّو بنتے رہے۔ مارتھا نے راز فاش کر دیا تھا۔

نرس مارلین ان دنوں برق تجلّی بنی ہوئی تھی۔ اس کی کافر نگاہوں کی ظاہراً حسین معصومیّت، اسکا اچانک چنچل پن، اسکی نقرئی آواز کا رس۔ اسکا معتدل صبیح رنگ، اسکے جسم کا ارمان خیز گداز۔ یہ سب چیزیں مل کر ایک محشرِ خراماں برپا کرتی تھیں۔ کونسا دل تھا جو مارلین کے نام ہی سے دھڑک نہ اُٹھتا ہو۔ اور ڈاکٹر کریمی تو اسے اپنی تمناؤں کی دنیا کی ملکہ سمجھتے تھے۔ مارلین کی یہ فطرت تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ پروانوں کو اپنی محبت کی آگ میں جلانا چاہتی تھی۔ شاید وہ شمع کی طرح جلنا بالکل جانتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ عشقِ جنوں پرور کے تماشے نہایت سکون سے دیکھنے کی عادی تھی۔

مہینوں انتظار کھینچنے کے بعد کریمی سے مارلین ذرا ملتفت ہوئی۔ کریمی نے تحفہ تحائف کی بارش کر دی اور اپنے لئے بھی انہوں نے کئی نئے سوٹ بنوا ڈالے۔ کامرانی محبت کی منزل ابھی تک اسپتال کے وارڈوں ہی میں تھی۔ جائز و ناجائز فرصت کی گھڑیوں میں کریمی مارلین کے وارڈ کی طرف جانکلتے تھے۔ 'ایبڈ وفارم'، 'ٹنگچر آیوڈین' اور دوسری دواؤں کی بو کے ساتھ 'ایتھر' اف زنر' اور

"ایوننگ ان پیرس" کی بو بھی مل جاتی تھی مریضوں کی کراہوں کے ساتھ قہقہے بھی شامل ہو کر قماش حیات کی نیرنگی میں ایک عجیب تنوع پیدا کر دیتے تھے۔ مگر تا حال عشق فداکار کو خلوت حسن میسر نہیں آئی تھی۔

آخر ش ایک روز ڈاکٹر کریمی کی التجائیں کامیاب ہو گئیں۔

"کریمی ڈیر! اگلی میری ایوننگ اوف ہے۔ یہ شام سیر و گلگشت میں بسر ہو سکتی ہے فٹن پر پولو فیلڈ پھر کلبز اور اس کے بعد سینما ـــــ نہیں ان دنوں موسم بہت خراب ہے۔ پولو فیلڈ نہیں صرف 'ہیرپلیائز' اور فلم۔ ہے نا! ـــــ کیا تم دل شکستہ ہو گئے؟"

موریسن نے نہایت ہی شیریں انداز میں ان کلمات کی بارش کی۔ کریمی کے لئے یہی بہت تھا کہ مارسین کے پہلو میں کچھ گھنٹے گذر جائیں۔ شوق فراواں کے باوجود وہ پولو فیلڈ کی نفی کو بادل ناخواستہ برداشت کر گئے۔ مارسین نے محض کریمی کے شوق کو بھڑکا کر ناکامیاب بنانے کے لئے پولو فیلڈ کا تذکرہ کیا تھا۔ جذبات سے کھیلنا کافر ماجرا حسینوں کا مرغوب مشغل ہوتا ہے۔

"میں اپنے کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت شخص سمجھتا ہوں۔ میرے لئے تمہاری ہر نوازش ایک عطائے بے بہا ہے۔" کریمی نے یہ جملے عصر حاضر کے نوجوان کی طرح ادا کئے۔

بس اسی گھڑی سے ڈاکٹر کریمی لطیف و شیریں خواب دیکھنے لگے۔ جیسے کوئی ہونہار طالب العلم امتحان کے یقینی نتیجے کو سننے کے لیے ایک خوشگوار بے قراری محسوس کر رہا ہو۔ موریسن کے تبسم زیر لب دلہن کی طرح ساری کائنات انہیں سرشار و رنگین نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی آئندہ کامرانی کی حقیقتوں کی تفصیل سے اپنے تخیل و تصور کو اس طرح روک رہے تھے جیسے کوئی بلی چوہے کو پکڑ پکڑ کر چھوڑ

دبتی ہو یا کوئی بچہ اپنی مرغوب مٹھائی مچل مچل اور اترا اترا کر کھاتا ہو۔ اس احساس کے ساتھ ایک ایسا پرستارانہ جذبہ بھی شامل ہے جو پجاری کے دل میں کسی عظیم و مقدس بُت کے چرنوں میں جھکتے وقت مضطرب سی ہچکچاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔

شام کو اپنے بہترین سوٹ کو لانڈری میں استری کرنے کیلئے دینا، اپنے نفیس ترین ہیٹ کو بار بار برش کرنا اور جوتے پر پالش لگوانا بھی۔ کریمی کے لئے حد درجہ رومان آفرین اور تخیل پرور کام تھے۔ آج ان پر یہ راز منکشف ہو رہا تھا کہ پتلون کی سیدھی اور نمایاں سلوٹ، سلیو لنک اور کالر بٹن کی چمک۔ اور جوتوں کی جھلک کی سی عام و پیش و پا افتادہ حقیقتیں اپنے اندر کتنا بڑا سرمایہ کیف و انبساط رکھتی ہیں حقیقت اور مثال ہم آغوش ہیں۔

رات بھر کریمی خیالاتِ جمیل کے اُڑن کھٹولے پر اُڑتے رہے خوابناک بیداری اور چونکتی ہوئی نیند کے عالم میں رات بسر ہو گئی۔ صبح اس طرح مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی جیسے خود ماریسن نیشنل ہسپتال کے وارڈوں میں طلوع ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کریمی مسرور تھے۔ وہ ایک انگریزی فلم کا گانا گاتے ہوئے بستر سے اُٹھے نہاتے وقت تو وہ جذبات کے بارے دبے جا رہے تھے۔ نل سے پانی چلوؤں میں لیکر انہوں نے لاابالی پن کیساتھ یونہی چھڑکنا شروع کیا ہیٹ کے مُنہ پر ہاتھ رکھکر فوارہ بنا دیا اور مختلف زاویوں میں پانی کی پچکار پھینکی۔۔۔ انہیں اپنا گورا جسم بہت حسین معلوم ہو رہا تھا بھرے بھرے بازو کی مچھلیاں، گٹھی ہوئی پنڈلیاں ۔۔۔۔ جسم کا مطالعہ اُن کیلئے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ رگوں میں خون کا ایک ہلکورا اٹھا اور اب اظہارِ جذبات کیلئے "اولومی!" کے بول کافی نہ تھے۔ کریمی فوراً ٹب کے نیچے چلے گئے۔ پانی کی دھاریں ان کے جسم کو مَس کرتی ہوئی نیچے گرنے لگیں اور وہ گا رہے تھے ۔

میں اُس کے یاسمین پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
میں اُس کے لعلِ لب سے کس طرح بوسے چراؤں گا

ڈاکٹر کریمی آج کچھ سویرے ہی وارڈ چل دیئے۔ اپنی ڈیوٹی پر جانے سے پہلے مارفین کے وارڈ میں جاکر انہوں نے شام کے پیمان کو اور زیادہ مستحکم کر لیا۔ پھر وُہ ایک شاداں اور کھلنڈرے خرگوش کی طرح اپنے کام میں آکر لگ گئے۔ وُہ فوارے کی طرح اُبلے پڑتے تھے۔ اسپتال کا اسپتال انہیں جنت نگار نظر آ رہا تھا۔ زندگی کے نئے نئے پہلوان کے پیش نظر ہوئے جاتے تھے۔ انجکشن کا سیرنج، انہیں کبھی تو ہولی کی پچکاری سا محسوس ہوتا اور کبھی طیارہ شکن توپ کی سی اہمیت اختیار کر لیتا۔ گاہ وُہ ایسا محسوس کرتے کہ موت و حیات کی کنجی صرف اُن کے ہی ہاتھ ہے۔ وسیع وارڈ ڈاکٹر کریمی کی جولانگاہ تھی، جہاں نمونیہ، ٹائیفائیڈ، کالا آزار اور طرح طرح کی بیماریوں کے مریض بھرے پڑے تھے۔ زندگی اور موت کی کشمکش کے درمیان مگر کریمی پر یہ احساس شدّت سے طاری تھا کہ نوعِ انسان کو بیماریاں محض اس لئے دی جاتی ہیں تاکہ کریمی امراض کو شکست دے کر لذتِ فتح حاصل کریں۔ آج وُہ مریضوں اور وارڈ کے قلیوں سے بڑی نوازش سے پیش آ رہے تھے۔

ڈاکٹر کریمی عموماً دو بجے دن کو اسپتال سے کوارٹر واپس چلے جاتے تھے۔ آج وُہ یہ سوچ رہے تھے کہ کوارٹر واپس جاکر کس کس طرح اپنے کو مورفین کے لائق بنائیں گے۔ ابھی بارہ بجے تھے۔ وارڈ کا کام اب ختم ہی ہو چلا تھا۔ دو بجے فرصت، کھانا، شیو، غسل، ڈریس

یک بہ یک ان کی مختلف ڈیزائن کی ٹائیاں اور رومال چشمِ تصور کے سامنے رقص کرنے لگے . . . . . سنڈٹ اور پھر ——— اس کے بعد ڈاکٹر کریمی سے سوچا نہ گیا۔ صرف انکا دل دھک سے حلق تک آکر رُک گیا اور پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"جو رباڈ نمبر ۱۳ کی حالت خراب ہے"۔

ٹھیک اُسی وقت ایک قلی نے آکر کریمی کو اطلاع دی۔" اوکچھ نہیں! ابھی اچھا ہو جاتا ہے . . . . ." یہ کہتے ہوئے کریمی بڈ نمبر ۱۳ کی طرف لپکے۔ "اس پر نمونیہ کا مریض ایک تیس سالہ شخص تھا۔ اونچا بخار تو خیر اُسے دیر سے تھا۔ ابھی اچانک اُسکی سانس اُکھڑنے لگی تھی۔ کریمی نے فوراً آکسیجن سلنڈر منگوایا اور اُس کی نلکی کا بالائی قیف مریض کی ناک سے لگوا دیا، کافور کا انجکشن دیا اور تقویتِ قلب کے لئے اور بھی دوسری دواؤں کے اہتمام میں مشغول ہو گئے کریمی پر تیقن کی گہری کیفیت طاری تھی۔ کیا ہوا! ایک جسم کی عمارت میں تھوڑی سی آگ لگ گئی۔ آگ بجھانے والا انجن موجود ہی تھا۔ بخار کی آگ اور نمونیہ کے دشمن پر فتح پانا بس ایک اُنگلی کے اشارے کا کام تھا اور پھر دو بجے فرصت۔ موت کی شکست پر طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے زندگی کی ایک بہار آفریں شام پر کامرانی محبت کی مہرِ دوام ثبت کرنا! ——— مریض کی سانس ہنوز غیر منظم تھی مگر ڈاکٹر کریمی کے خیالات مسلسل و مربوط تھے۔

کوئی ڈیڑھ بجے بڈ نمبر ۱۳ کی حالت قدرے سنبھلی۔ کریمی کو بالکل اطمینان ہو گیا۔ وہ ڈیوٹی کے کمرے میں جاکر نوجوان نرسوں سے چھیڑ کرنے لگے۔ گویا یہ شام کی تمہید تھی تبسناً

اچھے مریض بُرے حال مریضوں پر ترس کھاتے ہوئے وارڈ میں گھومے پھرتے تھے اور کبھی تین
چار فطری "چہ چہ چہ" کے بعد آکسیجن سلنڈر، برف کی ٹوپی اور کافور کے انجکشن سے بالکل بے پروا
ہو کر کسی جگہ مل کر بیٹھ جاتے، تاش کھیلتے، گپیں کرتے، نرسوں اور ڈاکٹر بابوؤں کے اندھیرے
اجالے کی باتوں پر رائے زنی کرتے اور پھر ایک بحرانی کیفیت کے ساتھ ہنستے ہنستے ملک الموت
کے کان بہرے کر دیتے۔ وُہ سارے فرشتوں اور شیطانوں کے کان بہرے کر سکتے تھے مگر وارڈ
کے اندر شور ڈاکٹر کریمی کو ناپسند تھا۔ ایسے موقعوں پر اُنہوں نے کتنے بیماروں کی گالیوں اور دھکوں
سے خبر لی تھی۔ آج وارڈ کے پھیپھڑوں میں خود اُن کے دل کی آواز ملی ہوتی تھی۔ سارکوما، ٹائیفائڈ،
نمونیہ اور سرسام کے ماحول میں ایک پُرشور قہقہہ بلند ہوا۔ موت کو زندگی کا چیلنج یا شکست کی خلش کو
دبانے کی ایک بیقرار کوشش! اُسی وقت وارڈ سے ایک نرس مسکراتی ہوئی آئی۔

"ڈاکٹر! بڈ نمبر ۱۳ کی حالت پھر بگڑ گئی"۔

کریمی نے گھڑی دیکھتے ہوئے بیقراری کیساتھ اس جملے کو سنا۔ دو بج چکے تھے

اب کریمی کو خلجان شروع ہوا۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ مشکلوں سے وُہ آدھ گھنٹہ اور
دے سکتے تھے۔ بھاگتے ہوئے وُہ مریض کے پاس گئے۔ ایک انجکشن اور لگایا۔ کارڈیزول کی گولی
کھلائی اور آکسیجن کی نلکی کو ذرا درست کر دیا۔ تھوڑی دیر وُہ بیمار کے سرہانے انتظار کرتے
رہے۔ مگر اُس کی حالت یکساں ٹھہری ہوئی رہی۔ کریمی بے صبر ہو کر ڈیوٹی روم میں چلے گئے
اور حالت کا انتظار کرنے لگے۔ وُہ اپنے فاؤنٹن پن سے یونہی اعصاب کے کھچاؤ کو کم کرنے
کے لئے غیر شعوری طور پر کھیلنے لگے۔ ۔ ۔ "پیریٹائیز" سینما۔ مارفین سے اختلاط ——— کافور کا

انجکشن "کارڈیزول" سیاہ سوٹ، چک ٹائی "ہیمالین بوکے" "عمرِ خیام" یہ آکسیجن سلنڈر، لپ اسٹک یہ سب چیزیں گڈمڈ ہو کر اُن کے دماغ کو نیرنگِ خیال بنا رہی تھیں۔ کریمی تصوّر کے ڈھلوان پر ذرا دور تک پھسلتے چلے گئے۔ اسپتال سے بہت دور۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مارٹینی کا یاقوتی لپ اسٹک محض پیازی رہ گیا۔ حدتِ جذبات کے سامنے کتنے کس پروف نقش برآب ہو کر خواب و خیال ہو گئے۔ واردات کی شدت سے کریمی خود چونک پڑے اور پھر انہیں نمونیہ کا جاں بلب مریض یاد آیا۔ گھبرا کر کرسی سے اُٹھ بیٹھے اور سیدھے بڈ نمبر ۱۳ کے پاس تیزی سے گئے۔ مریض ابھی تک زندگی کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ علامتیں ایسی تھیں کہ اُس کے جانبر ہونے کی کوئی امید نہ تھی مگر روح اپنا نیا سفر شروع کرنے سے ڈر رہی تھی۔ کریمی پریشان ہو کر وارڈ سے ڈیوٹی روم، اور ڈیوٹی روم سے وارڈ کے پھیرے دینے لگے۔ ڈھائی بج گئے۔ مگر موت و حیات کے کھیل کا فیصلہ نہ ہوا۔ جونیئر ڈاکٹر سرینش بھی لوٹ کر ہنوز نہ آئے تھے۔ . . . کریمی اُس کی راہ دیکھنے لگے۔ گھڑی کی سوئی کے ساتھ ان کی بیقراری بڑھنے لگی، ابھی انہیں کتنے کام کرنے تھے۔ دوبارہ شیو، غسل، کپڑوں کی درستگی وغیرہ وغیرہ اور بیمار مر بھی نہیں چکتا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر کریمی! کیا خبر ہے؟"

یہ ڈاکٹر سرینش کی آواز تھی۔ کریمی کی جان میں جان آئی۔ "بڈ نمبر ۱۳ کی حالت خراب ہے" اُس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوا؟ کرائیسس تو تھا۔ کیا کولیپس کر رہا ہے؟" "ہاں کولیپس!"

دونوں ڈاکٹر مل کر وارڈ میں گئے۔ بڈ نمبر ۱۳ کی زندگی کا چراغ ابھی تک جل رہا تھا۔ شاید آکسیجن

کے سہارے۔ یک بہ یک کریمی کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی۔ کیوں نہ آکسیجن سلنڈر کو ہٹا دیا جائے۔ مگر وہ ایسا کرنے نہ پائے۔ اس خیال پر ضمیر نے تھوڑی سی ملامت کی بھی مگر نا خبر کے احساس نے خلجان میں اور اضافہ کر دیا۔

"سریش! میں جاتا ہوں اب۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔ تم دیکھ لینا اسے۔"

"اگر مر گیا تو ڈیتھ سرٹیفکیٹ، تو آپ ہی کو دینا ہوگا۔ آپ کے دستخطِ تصدیقِ موت کے لئے ضروری ہیں۔ آپ سپنتر ہیں۔"

کریمی چپ ہو گئے اور خاموشی سے آکر ڈیوٹی کے کمرے میں بیٹھ رہے۔ سریش بھی کچھ کام کر کے کمرے میں واپس آئے۔

"بیڈ نمبر ۱۳ مر چکا؟" کریمی نے اثباتی جواب کی توقع میں یہ سوال بیقراری سے کیا۔ تین بج رہے تھے۔

"نہیں ابھی نہیں"۔ سریش نے جواب دیا

"اُف اوہ بہت وقت لے رہا ہے۔" کریمی یہ کہتے ہوئے کرسی سے اُٹھ بیٹھے

"سریش بابو! میں کوارٹر جاتا ہوں۔ چار بجے تک میں کوارٹر میں رہوں گا۔ اس وقت تک وہ مر ہی جائیگا۔ موت کی تصدیق کے لئے مجھے بلوا لیجئے گا۔" —— کریمی ٹوپ سر پر رکھ کر روانہ ہونے والے ہی تھے کہ اسپتال کا دربان ہانپتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"حجور! ڈاکٹر مکرجی آپ کو فون پر بلاتے ہیں۔"

کریمی بدحواس ہو گئے۔ ڈاکٹر مکرجی اِس وارڈ کے انچارج تھے۔ کریمی دوڑے ہوئے فون

پڑ گئے۔ پتہ یہ چلا کہ وزیر بلدیات کے معتمد پارلیمانی کے چچا کو اختلاجِ قلب کے دورے پڑ رہے ہیں۔ وُہ فوراً اسپتال لائے جانے والے ہیں۔ پے انگ وارڈ کی بالائی منزل میں جگہ بنائی جائے۔ بڑائے بہادر ڈاکٹر مکرجی مریض کو ساتھ لیکر خود تشریف لا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کریمی کے اوسان خطا ہو گئے۔ وُہ چاہ رہے تھے کہ سارے چچاؤں، سارے پارلیمانی معتمدوں اور سارے وزیروں کو بڈ نمبر ۳۱ کیساتھ بیک وقت موت کی سند دے دیں مگر انہیں خود ڈاکٹر مکرجی سے اچھے کارکردگی کی سند لینی تھی۔ وُہ غصّے کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پگھلا ہوا سیسہ اُن کے حلق سے نیچے اتر رہا ہے، پے انگ وارڈ مع ڈاکٹر کریمی کے، وزیر بلدیات کے معتمد پارلیمانی کے چچا کا انتظار کھینچ رہا تھا پانچ بجے ایک شاندار وی ایٹ کار، پے انگ وارڈ کے سامنے آ کر رکی۔ اس درمیان میں کریمی پر ایک قیامت گذر گئی۔ قیامتِ صغریٰ نہیں بلکہ کبریٰ سے بھی زیادہ بڑی، زیادہ شدید، زیادہ اہم۔ کریمی کا سارا پروگرام خراب ہو رہا تھا۔ آرائش و تزئین کے سارے منصوبے خاک میں ملے جا رہے تھے اور ایفائے وعدہ کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ چھ بجے، ٹھیک چھ بجے ماربین، اُن کے ارمانوں کی دولت، اُن کے قریب ہوگی۔ اس کا قیمتی جسم اُن کے جسم سے مس کرے گا اور وُہ اس لمحہ زریں کی پذیرائی کے لئے اپنے آپ کو اب تک آراستہ بھی نہ کر سکے۔ اُن کی حیات رائگاں جا رہی تھی دُنیا اور ساری کائنات کا عظیم ترین کام محض معتمد پارلیمانی کے چچا کے لئے ادھورا رہا جاتا تھا۔ دُنیا اور دنیا والے کس قدر بے اصولے اور ناانصاف ہیں۔ یہی وقت اختلاجِ قلب کے دوروں کا تھا ...... مگر اب تو وہ حالت منتظرہ دور ہو چکی تھی۔ اضطراب کی گھڑیاں کٹ ہی چکی تھیں۔ ڈاکٹر مکرجی معتمد پارلیمانی کے ساتھ آ گئے تھے ـــــ آہ! مگر کیا ڈاکٹر کریمی کو اتنا وقت ملے گا کہ

وہ دعوتِ مژگاں کے لئے جگرِ لخت لخت کو جمع کر لیں۔

ڈاکٹر مکرجی نے رپے انگ وارڈ آکر بھی چچا کا معائنہ کیا اور بہت سی ہدایات دیکر رخصت ہو گئے۔ کریمی موٹر تک رائے بہادر کو پہنچانے گئے۔ سیڑھی سے اُترتے ہوئے انہوں نے چند فوجی گوروں کو نرس کوارٹر کے سامنے سائیکلوں پہ منڈلاتے ہوئے دیکھا اور بالائے بام چند رنگین بلبلوں کو نظارہ فروش پایا۔ ان کا دل رقابت کے تیر سے چھلنی ہو گیا۔ پھر انہیں موریسن کے خیال سے تسکین ہوئی۔ کیا پرواہ سب سے گراں قدر موتی تو ٹھیک چھ بجے اُن کے گلے کا ہار ہونے والا تھا۔

موٹر کے پاس عام وارڈ کا قلی یہ پیام لایا کہ بڈ نمبر ۲۱ مر گیا۔ موت کی سند دینے کیلئے ڈاکٹر کریمی کو جانا تھا۔

"کریمی! اس مریض کو پے انگ وارڈ بھیجدو۔ ہدایات سمجھا دینا ——— اچھی طرح!"

یہ کہہ کر ڈاکٹر مکرجی اپنی موٹر پر ہوا ہو گئے۔

کریمی سیدھے جنرل وارڈ گئے اور جلدی جلدی اپنا کام ختم کر کے کوارٹر واپس آئے۔ چھ بجنے کو پندرہ منٹ باقی تھے۔ بیچلر کوارٹر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے انہوں نے چار پانچ نرسوں کو فلٹن پہ گزرتے دیکھا۔ انہیں شبہ ہوا کہ ان میں ماریسن بھی ہے۔ بھلا ماریسن ہزاروں میں ایک! اور عاشق کی آنکھیں اُسے پہچان نہ لیں۔ کریمی کو یقین ہو گیا اور ہاں چھ تو بج ہی رہے تھے۔ اور ٹھیک تو "پیریڈائز" میں ملنے کی جگہ مقرر ہوئی تھی۔ مگر یہ اتنی نرسوں کا ساتھ ہونا کیا معنی۔ وہ پھر شبہ میں گرفتار ہو گئے ——— اسی شبہ، یقین اور بے قراری کے عالم میں انہوں نے سوٹ تبدیل کیا اور آراستہ ہو کر فلٹن پر "پیریڈائز" کا رُخ کیا۔

"یس! اینز چلاؤ! پیر بڈایز!"

فٹن والے کو خاص صاحبانہ انداز میں حکم دیتے ہوئے ڈاکٹر کریمی ٹیڑھے ہو کر سیٹ پر دراز ہو گئے۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا۔ آرائش کے غیر مکمل ہونے کا تاسف، نعمتِ عظمیٰ کا انتظار اور مستقبل قریب کی کامرانی کا غرور کریمی کو مضطرب کر رہا تھا۔ اُن کا چہرہ تمتما یا ہوا تھا اور خیالات پریشان۔

آخر وُہ "پیر بڈایز" پہنچ گئے۔ کود کر فٹن سے اترے اور سیدھے اندر گھسے چلے گئے ——

وُہ متوقع تھے کہ ماریین مسکراتے ہوئے اُن کا خیر مقدم کرے گی مگر ماریین وہاں نہ تھی۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا۔ بیرا کو انہوں نے ڈانٹا، مینجر سے دریافت کیا اور جب اُنھیں قطعی یقین ہو گیا کہ ماریین نہیں آئی تو وُہ سمجھے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاید وُہ "کلنر" چلی گئی ہو۔ فٹن پر بیٹھ کر انہوں نے اسٹیشن چلنے کا حکم دیا۔ پیر بڈایز سے اسٹیشن تک کی منزل بڑی پہاڑ تھی۔ خدا خدا کر کے اسٹیشن آیا۔ کریمی چھلانگ لگا کر گاڑی سے اُترے اور پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر انہوں نے "کلنر" کا رخ کیا۔ وُہ کمرے میں داخل ہو گئے —— وہاں ماریین، تین اور نرسیں اور چار فوجی گورے خوش فعلیاں کر رہے تھے۔

ڈاکٹر کریمی کو دیکھ کر سب نرسیں ہنس پڑیں۔ کریمی سمجھے —— "میری تاخیر پر ہنس رہی ہیں!"

بیل گاڑی

ڈسٹرکٹ بورڈ کی لانبی سڑک پر بیل گاڑیوں کی قطار آہستہ آہستہ چلی جارہی تھی بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی مسلسل آوازیں کھیتوں کی وسعت میں مدھم ہو کر اور شام کی غنودگی میں گھل کر خواب آور نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔ مویشیوں کے آخری گلے گھروں کو جارہے تھے۔ چرواہے انجام کار کی مسرت میں تانیں اڑا رہے تھے۔ ایک آدھ بھٹکا ہوا کوا یا مینوں کے غول سرمئی فضا میں تیزی سے پر مارتے ہوئے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف جارہے تھے۔ پروں کی تیز سنسناہٹ سے چونک کر گاڑیبان آسمان کی طرف تکنے لگتے تھے۔ پھاگن کے مہینہ کا آغاز تھا۔ شام کی ہوا میں نرم سی سردی تھی۔ بستیوں کے چولھوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے پرپیچ گالے اب میدانوں میں آوارہ بھٹک رہے تھے۔ دھان کی فصل کٹ چکی تھی اور کھیتوں میں ابھی تک کھونٹیاں باقی

تھیں۔ کسانوں کے چہروں پر مسرت و انبساط کی موجیں مچل رہی تھیں۔ ربیع کے کھیت لہرا رہے تھے۔ اُن کی ہریالی گہرے کاہی رنگ میں تبدیل ہو چکی تھی اور کہیں کہیں پکتے ہوئے خوشوں کے پیلے پیلے دھبے نمایاں ہو کر گلدار چھینٹ کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔

موتیا گاڑیبان نے سوچا کہ وُہ اپنی بیوی کو ایسی ہی گلدار ساری اب کے ہولی میں خرید کر دیگا
موتیا منظر کے سکون سے متاثر ہو کر اپنے من سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے دل میں مسرت اور اطمینان کی ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں چین کی موجوں میں بیتتے ہوئے دنوں کے دکھ بھی بہے جا رہے تھے آخر کار اُسے کام مل گیا تھا۔ صبح اُسے ڈھلائی کی اُجرت مل جائے گی۔ ایک روپیہ! اُس نے اپنی مٹھی میں چمکتے ہوئے سکّے کو محسوس کیا۔ ایک روپیہ! ایک دو ڈھولائی اور بھی مل ہی جائیگی۔ مگر یہ ٹرک! سارا غلّہ تو موٹر پر ڈھل جاتا ہے۔ موتیا کے دل میں ذرا سی مایوسی پیدا ہوئی۔ اسکے دل نے کہا مگر اب کے علاقہ میں فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ ایک دو ڈھولائی مل ہی جائے گی۔ اچھی فضا میں، اچھے ہی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر جبکہ ایک ڈھولائی کی اجرت اُسے نقدا نقد صبح کو جہان آباد کے گولے پر ملنے والی تھی۔ اُس نے گول چمکتے ہوتے روپے کی کھنک سی سُنی۔ ہولی —— گلدار ساری —— موتیا نے اپنی سنوری اور لجائی ہوتی بیوی کا تصور کیا۔ گندمی رنگ کے نوجوان چہرے پر خوشی اور شرم کی ملی جلی کیفیت سے خون کی پچکاری سی چھوٹی ہوئی رسیلے لبوں پر گلال سا لگا ہوا۔ گلدار ساری کا آنچل، گداز اُبھرے ہوئے سینوں پر کھیلتا ہوا۔ ہولی اور اُس کی ساری رنگینیاں موتیا کے خیال کی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی گذر گئیں۔ ترنگ میں آ کر اُس نے ایک تان اڑائی۔

چولیا سے جو سُنا باہر بھیل ہو رہا

چیت ملے !

دوسرے گاڑیبان بھی، جو فضا کے سُکر پرور سکون کے جادو سے ماتے ہوئے تھے، جاگ سے گئے۔ بیل گاڑی کے آہستہ رو کاروان میں زندگی اور حرکت پیدا ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ سب پر ایک ہی کیفیت طاری تھی۔ سب موسم اور فضا سے لطف اندوز تھے اور روزگار کے چل نکلنے کی مسرت کو خوشی کیساتھ محسوس کر رہے تھے۔ اُنہوں نے بیلوں کے پٹھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹُنکارا۔ اے اسے ہیے بڑھے"! ٹُ ٹَ ٹَ ٹُ ہے ٹ ٹ بڑھے" ! بیل تیز چلنے لگے۔ کاروان کی رفتار بڑھ گئی۔ برہے، دوہے، پھاگ اور بارہ ماسے الاپے جانے لگے۔ راہگیروں سے تھوڑا سا ٹھٹول ہوا۔ لانبی گھونگھٹ والی عورتیں بیل گاڑی کی قطار سے ذرا کترا کر نکل گئیں۔ مسافر تیز قدم اٹھاتے بڑھے جا رہے تھے تاکہ رات سے پہلے اپنی اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ کھیتوں کے درمیان کھلیانوں میں دھان کے پونج اور پوال کے ڈھیر اپنے سنہرے پن سے نظروں کو خوش اور دلوں کو مطمئن کر رہے تھے۔ بیلوں نے کنکھیوں سے پوال کی طرف اور گاڑیبانوں نے گردنیں پھیر پھیر کر غلّے کے انبار کی جانب دیکھا۔ دور اور نزدیک کی بستیوں کے کنارے لڑکے کھیل اور کتّے بھونک رہے تھے اور پنگھٹوں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ بیل گاڑی کا کارواں کھیتوں کے درمیان کچی سڑک پر ایک آگے بڑھتی ہوئی لکیر بناتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

دھیرے دھیرے رات نے سارے منظر کو اپنے کالے بانے میں لپیٹ لیا۔ آسمان پر تاروں کے چراغ جل گئے اور دور گاؤں میں کسانوں نے اپنے دیئے روشن کر لئے۔ گاڑیبانوں نے کاروان میں

چار پانچ لالٹینیں جلالیں اور انہیں گاڑیوں کے نیچے لٹکا دیا۔ کئی گاڑیبان ابھی تک گیت گا رہے تھے۔ راہ کے اونچے درختوں پر اپنے بسیروں کے اندر ایک دو پرندے پھڑپھڑا اُٹھتے اور دھیمی آواز سے چیخ پڑتے تھے۔ موتیا اب تک مسلسل گاتا جا رہا تھا۔ اُس کے دل میں زندگی کے ولولے اُٹھ رہے تھے۔ وُہ سرور میں مگن تھا۔ رفتہ رفتہ سبھی گاڑیبان غلہ کے بوروں سے ٹیک لگا کر یا اُن پر چڑھ کر سو رہے۔ ان کے گیت یکے بعد دیگرے بند ہو گئے۔ کھیتوں میں گیدڑ بولنے لگے بیل گاڑیوں کی چرخ چوں رات کے سناٹے میں نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ کارواں بڑھتا جا رہا تھا اور موتیا عالمِ تصور و تخیل کی سیر کر رہا تھا

اُس نے سوچا کہ اب کے دفعہ دھان کی فصل اتنی ضرور ہوئی ہے کہ وُہ مالگذاری ادا کر کے سال بھر بخیریت بیٹھ کر کھا سکے گا اور جو غلّہ کی ڈھولائی کا روزگار چل نکلا تو پھر کپڑے لتّے بھی ہو جائیں گے۔ تین سال سے ہولی اور دسہرے پر پھٹے اور پیوندہی پر گذارا کیا ہے۔ شادی کو بھی تین سال ہوئے، مگر اُس نے اپنی نوجوان بیوی کے لئے کبھی کوئی سوغات نہیں لائی۔ ایک بچہ ہے وُہ ہمیشہ ننگا ہی رہا۔ تقدیر کا لکھا کون مٹائے مگر اب کے بھگوان نے دیا کی ہے۔ سب دلدّر دور ہو جائیں گے موتیا کو ساری دُنیا بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ کیسی اچھی ہوا تھی، کیسا اچھا آسمان، اور تارے جیسے کہانیوں کے راجہ کی شال میں موتی ٹکے ہوں۔ بیل گاڑی کی چرخ چوں، چوں چوں کھٹ میں اُسے ایک سریلا نغمہ سُنائی دے رہا تھا۔ یہ گیدڑ بھی بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ رات کی سنسان فضا کو کیسا گلزار کئے دیتے ہیں۔ اس کے دل سے مسرت چھلک رہی تھی۔ اُس نے پھر گانا شروع کیا۔

دور دیسوا سے لاہن سوگات

وُہ دیر تک مختلف راگ الاپتا رہا۔ اب اُس کا دل باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔۔۔"ہے بدّو اتنا جلدی سو گیا رے! ابھی تو رات بھنگو و نہ گیا ہے۔" اُس نے اپنے ایک جوڑی دار گاڑیبان کو آواز دی۔ جواب میں سوئے ہوئے گاڑیبانوں کے خراٹے تھے۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے من کی موج میں سب کو گھیر لے، اپنی مسرت میں سب کو غرق کر دے۔ ہر ہر ستارہ سے باتیں کرے ہوا کی لہروں کو پیام دے۔ عرصۂ دراز تک سہے ہوئے دل کو سکھ کی امید سی بندھی تھی۔ یہ اُمید مسرت موتیا کو کتنی عزیز تھی۔ اُس کا دل خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ عین خوشی کے عروج کے وقت ایک مبہم سا خوف اُس پر طاری ہوا جیسے کسی ماں پر اپنے بہت ہی صحت مند بچے کو دیکھ کر طاری ہوتا ہے اُس نے اس مبہم مگر اندوہ خیز خیال سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ لیکن دبے پاؤں پیچھے سے آنے والے بھوتوں کی طرح یہ خیال اُس پر حاوی ہونے لگا اور رفتہ رفتہ بہت ہی واضح ہو گیا۔۔۔

مالگذاری تو اس سال کی ادا ہو جائیگی اور کھانے کو بھی بچ رہے گا۔ مگر تین سال کا بقایا، زمیندار کا سخت تقاضا اور ساہوکار کا قرض۔ . . . موتیا کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اُس کا نشۂ مسرت ٹوٹتا ہوا معلوم ہوا اور اُسے خمار کی سی تکلیف محسوس ہوئی۔ آدھا سے زیادہ غلّہ تو کھلیان ہی سے چھینک لیا جائیگا۔ پھر وہی سال بھر آدھا پیٹ کھانا ۔۔۔ اور قرض کا تقاضا ۔۔۔ سود بھی تو ادا نہیں ہو سکے گا۔ ایک سرد تاریکی میں وُہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی صدا بہت دور سے آنے والی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ آسمان پر ستارے ابھی تک اپنی سبھا سجائے ہوئے تھے۔ موتیا کے دل کے ولولے نا امیدی کی روح فرسا تاریکی سے نکل کر چلنا

ٹوٹ کر بکھر پڑا۔ براہل ساہو کا اور ساؤ جی کا ڈرائیور قلابازیاں کھاتے ہوئے زمین پر آرہے اور مٹی کے برتن کی طرح چکنا چور ہو گئے ——— رادھا کے لئے بہت سی ساریاں بازار سے لائی گئی ہیں۔ رنگ برنگ کی بوٹے دار موتیا بھی نئی گلابی دھوتی اور پیلی پیلی مرزئی پہنے بھنگ پی رہا ہے۔ رادھا بن سنور رہی ہے۔ وہ اٹھلاتی ہوئی آئی۔ اس کی رسیلی جوانی اور اس پر اس کی متوالی آنکھوں میں لاج کی رنگین سطح کے اندر پریم کے چنچل بلاوے ——— "اٹھ رے موتیا! کب تک سوتا رہیگا" اس کے جوڑی دار گاڑی بان نے آواز دی۔

"ہے رے موتیا۔ دادا کے کلیجہ پر سویا ہوا ہے؟ دیکھو تو جبرا۔ تیرا کون اٹھا دے گا رے۔ نکھٹو! اای جوانی ہے!"

ایک بوڑھے گاڑیبان نے دھونس جمائی ——— ایک تیسرے نے موتیا کا شانہ ہلا کر اُسے اٹھایا۔ وہ چونک کر، جمائیاں لیتا اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ بیل گاڑیوں کا کارواں چھیدی ساؤ کے گودے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا احاطے کے اندر اور بھی بیل گاڑیاں مختلف انداز میں لگی ہوئی تھیں، کسی کا جؤا اوپر کو اٹھا ہوا، کوئی ٹیک سے لگی ہوئی، چند ہنوز بیلوں کے کاندھوں پر، کوئی خالی اور بہت سی بوروں سے لدی ہوئی۔ یہ نیا آنے والا کارواں بھی سب کے ساتھ آکر مل گیا اور بورے ڈھوئے جانے لگے۔

صبح ہو چکی تھی اور زندگی کے آثار سارے بازار میں پیدا ہو گئے تھے۔ بوروں کی ڈھولائی سے فارغ ہو کر گاڑی بانوں نے ساتھ لایا ہوا ستو یا بھونا کھایا، پیٹ بھر ڈکر کر پانی پیا، اپنے گاؤں

چلتے تھے ابھی تک وُہ یاس کے بھنور میں ڈوبے نہیں تھے ۔خوشی کتنی کمیاب اور انمول چیز ہے ۔
وُہ مسرت کے خزانے سے یوں آسانی سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا ۔شام ہی سے اُسے یہ دولت
مل گئی تھی ۔ستاروں کی چمک اُسے دعوتِ انبساط دے رہی تھی ۔مہوا اور نیم کے پھولوں کی خوشبو کی لپٹ
نے اُس کی طبیعت میں گدگدی پیدا کی ۔وُہ بُرے اور تکلیف دہ خیالات کو کچل دینا چاہتا تھا
اُس نے انہیں دفن کر دینے کی پوری کوشش کی ۔دماغ نے بھی ایک بات بنائی یہ بیل گاڑی
کا روزگار اب کے خوب چلے گا ۔بس پھر کیا تھا اُس نے بُرے خیالات کو گویا پیچھے ایک جھٹکے کیساتھ
دھکیل دیا مگر تاریکیوں کی گہرائی سے اُسے چند موٹر ٹرک اُبھرتے ہوئے دکھائی دئے ۔پھر وُہ خلا
میں غائب ہو گئے ۔اُس نے نفرت کے ساتھ اُس جانب سے آنکھیں پھیر لیں اور نا امیدی کے
آخری وار سے بچنے کے لئے اُس نے پھر گانا شروع کیا اور اُس کے دل نے سوچا ——"اونہہ
ٹرک ، اب کے غلہ بہت ہوا ہے ۔بغیر بیل گاڑی کے کام کہاں چلے گا "——
گنگناتے گاتے وُہ اونگھنے لگا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد بوروں سے اٹک کر سو گیا ——
سب سوئے تھے ۔بن ہنکائے بیل اپنی ڈگر پر چلے جا رہے تھے اور بیل گاڑیاں بڑھتی جا رہی تھیں ۔
—— ہولی ہے ۔عبیر اور گلال مَلے جا رہے ہیں پچکاریوں سے رنگوں کی بارش ہو رہی ہے ۔
یاروں کے دُھر کھیل . . . . رادھا پکوان اور پُوتے چھانک رہی ہے ۔بچہ لال لال کپڑے
پہنے کھیل رہا ہے —— یک بیک ایک موٹر ٹرک نمودار ہوا ۔راکھشش کی طرح رینگتا ہوا ——
—— اس پر زمیندار کے برابر اور ساہوکار بیٹھے ہوئے ہیں ۔موہنیا نے رنگ کی ایک پچکاری سے
ٹرک پر نشانہ لگایا ۔اُس کے چھپاکے چوٹ کے ساتھ موٹر ٹرک فضا میں اڑ گیا اور ٹوٹا

گے بننے کے کارندے سے ڈھولائی کی اجرت لی اور مختلف کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کوئی پڑ کر سو گیا۔ کسی نے بازار کا رُخ کیا اور کوئی تاڑی خانہ کی طرف چلا گیا۔ مونیا کو بھی اجرت ملی۔ چاندی کا چمکتا ہوا ایک روپیہ۔ اُس نے اُسے دھوتی کی ایک کھونٹ میں کئی گرہ دیکر باندھا اور آڑھت کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ بیلوں کو پیار کیا اور گاڑی کے سایہ میں جا کر لیٹ رہا۔ اُس نے خیال کیا کہ ہر ایک روز کے بعد اُسے اسی طرح روپے ملیں گے۔ اُس نے احساسِ مسرت کی دولت کو دل میں دبا لیا اور آنکھیں بند کر لیں مگر خیالات کی زیادتی کی وجہ سے وہ سو نہ سکا۔ ایک دو کروٹیں بدلکر اُٹھ بیٹھا۔ پھاگن کی سنہری دھوپ ہر طرف پھیل رہی تھی۔ پچھیا کی نرم موجیں طبیعت میں امنگ اور بالیدگی پیدا کر رہی تھیں۔ آڑھت شہر کے ایک کنارے تھی۔ سامنے شاداب کھیتوں کے بارور پودے ہوا کے جھولے پر خوشی کی پینگیں لے کر جھول رہے تھے۔ دور درختوں کی بلندیوں سے فاختوں کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ مونیا کا دل بھی کوکنا چاہتا تھا۔ مسرت اور درد کی ملی جُلی کوک۔ قلبِ انبساط و مسرت میں بھی ایک ہلکا سا درد، ایک نرم سا سوز ہوتا ہے۔ مونیا دیر تک بیٹھا ہوا یونہی چاروں طرف دیکھتا رہا پھر انگڑائی لیکر اٹھا۔ اُس نے انگڑائی لینے میں مبالغے سے کام لیا، جیسے وہ کسی خواہش کو دبا رہا ہو۔ آدھے ارادے کے ساتھ وہ بازار کی طرف چل نکلا۔ سڑک کے ایک کنارے پر اُس نے تاڑی خانہ کو لالچ کی نظروں سے دیکھا۔ کئی مزدور اور ایک دو گاڑیبان دونے پر دونا چڑھا کر پھاگن کی نورس پری کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ اُس نے ضبط سے کام لیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک دو بار پھر کر بھی دیکھا لیکن بڑھتا گیا۔ بھرے بازار میں وہ گھومتا رہا یونہی مگر اُس کے دل میں ایک دبی ہوئی خواہش تھی کہ وہ سب کچھ خرید لے کپڑے، مٹھائیاں، چوڑیاں، ترکاریاں، سر میں دینے کا تیل، کنگھی، سیندور، اور تاروں کی طرح چمکتی ہوئی

ننھی ننھی سی ٹکلیاں ——— ان سے سج کر رادھا کیسی سندر لگے گی ——! وہ اپنے خیالات میں گمن دیر تک بازار کی سیر کرتا رہا۔ اپنے سُر میں وہ راہگیروں سے ٹکرا بھی جاتا کبھی ان کی جھڑکیاں بھی سُن لیتا، لیکن خود اُس کی طبیعت میں اُن گھڑکیوں سے بھی چڑچڑا پن پیدا نہ ہوتا۔ اس کا دل خوش تھا۔ مسرت میں بہت پھیلاؤ ہے۔ اُس میں سب کے لئے جگہ ہے۔ خوش وخرم انسان وسیع القلب ہو جاتا ہے۔ موہنا کو ہر چیز اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ سب لوگ بھلے تھے۔ اسکی گرہ میں ایک روپیہ تھا اور اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ ایک روپیہ یعنی سولہ آنے۔ سولہ آنے! سرِ دست اِن سولہ آنوں میں کسی کا حصّہ نہ تھا۔ یہ سارے کے سارے آنے اُس کے تھے، اپنے ——سیر کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا۔ اس کا جی بھر گیا۔ اور وہ بازار سے باہر آنے لگا۔ آتے وقت اُسے کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ اُس نے اپنی خوشیوں میں تھوڑا سا اتار پایا۔ اُسے تکلیف ہونے لگی۔ دبی ہوئی خواہشیں ابھرنے لگیں۔ وہ بھرے بازار سے خالی ہاتھ جا رہا تھا۔ یہ احساس موہنا کے دل میں چبھنے لگا اور انحطاطِ مسرت کی خلش برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ واپس لوٹا۔ اُس نے اِس اقدام میں تسکین سی پائی۔ اس کے دل میں پھر خوشیوں کی پچکاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ بڑی امنگ سے وہ سارے بازار میں پھر پھر کر سوغاتیں خریدنے لگا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا خریدے اور کیا نہ خریدے۔ آخر کار اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ بڑی چاؤ سے گرہ کھول کر اُس نے روپیہ نکالا۔ روپیہ نکالنے میں ایک بے آزار غرور کا سرور تھا۔ اُس نے گندھی کی دوکان پر جھن سے روپیہ پھینکا۔

"دو آنے کا چمبیلی کا تیل دو دھائی صاحب!" ایک چھوٹی سی لانبی شیشی میں گندھی نے چمبیلی کا تیل دیا اُسے۔ اُس نے دوسری دوکان سے تھوڑا سا سیندور اور ٹکلیاں خریدیں۔ ایک ایک آنے

کی۔ چلتے چلاتے حلوائی کی دکان سے اپنے لڑکے کے لئے موتیا نے ایک آنے کی جلیبیاں بھی مول لیں اور ایک باوقار شوہر اور باپ کی طرح وہ آڑھت کی طرف آیا۔ بہت تاخیر ہو چکی تھی، سب گاڑیبان گاؤں کو واپس جا چکے تھے۔ اُس نے پوچھ گچھ سے یہ پتہ چلایا کہ اس کے ساتھی یہی ایک ڈیڑھ کوس آگے نکل چکے ہونگے۔ گاڑی جوت کر اُس نے بھی گاؤں کی راہ لی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ موتیا بیلوں کو ہانکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے ساتھیوں کو پکڑ پائے ایک دو میل کی تیز رفتاری کے بعد بیل تھک گئے اور اپنی فلسفیانہ رفتار سے چلنے لگے۔ زندگی کی تگ و دو میں کیا رکھا ہے۔ بھوسے یوں بھی ملیں اور دوں بھی، اور ہمیشہ آدھا ہی پیٹ۔ آہستہ آہستہ گردن ہلا ہلا کر بیل نہایت ہی متانت وسکون کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ موتیا نے بھی انہیں قسم لا دے کر آگے بڑھانے کی کوششیں چھوڑ دیں۔ کارواں سے جا ملنا مشکل تھا۔

دھوپ میں تمازت آگئی تھی اور چکناہٹ بہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سنسناتی ہوئی ہوا گرد کی چادریں اٹھا اٹھا کر انہیں گردش دیتی تھی۔ ذرات خاک رقص کرنے لگتے تھے۔ موتیا نے سر پر اپنا گمچھا لپیٹ لیا اور اس کے خیالات بھی ناچنے لگے۔ اُس نے بارہ آنے بچا لیے تھے۔ انہیں وہ جمع کر دے گا اور دھیرے دھیرے اس کے پاس کئی روپے ہو جائیں گے۔ ہولی میں رادھا کے لئے ضرور وہ دو ساڑیاں خریدے گا۔ اور بھی بہت سے اچھے اچھے خیالات اس کے دماغ میں آئے۔ اکثر تو اس کا دل خیالی خوشی کے ہچکولے سے اُچھل پڑتا تھا۔ اُسے اپنی سوغاتوں کا خیال آیا اور اُس کے ساتھ ساتھ رادھا کی مسرت کا اور رامو۔ وہ تو خوشی سے پاگل سا ہو جائیگا۔ سارے گھر میں اودھم مچا مچا کر مٹھائی کھائیگا اوہ! رامو کتنا اچھا ہے۔ بڑا ہو کر وہ بھی ایک شاندار گاڑیبان بنے گا۔ اور اپنی رادھا کے لئے تحفے لائیگا

موتیا کے دل میں ایک کھلبلی سی مچی۔ اُسے خواہش ہونے لگی کہ بیل گاڑی موٹر بن جائے۔ اور وہ فر فر اڑتا ہوا اپنی سوغاتیں رادھا کے قدموں پر جا کر رکھ دے۔ ابھی فوراً آنکھ جھپکاتے ــــــ کاش ایسا ہوتا! اُس نے بیلوں کو ٹٹکارا، اُن کے پُٹھے سہلائے اور اُن کی دُم اینٹھی۔ وہ اپنی بیل گاڑی ہی کو موٹر کی رفتار سے چلانا چاہتا تھا ــــــ انتظار! انتظار! اُس مجھے کا انتظار! جب چمبیلی کا تیل، سیندور اور ٹکلیاں رادھا کو پیش کی جائیں گی۔ رامو دوڑا آئیگا ــــــ اور سارے ٹولے میں ہمسایوں کے یہاں باتیں ہونگیں کہ رامو کے باپ نے شہر سے بہت ساری چیزیں لائی ہیں ــــــ وہ کیسی مسرت و پندار کی گھڑی ہوگی ــــــ بے چینی کے ساتھ اُس نے پھر بیلوں کو للکارا ــــــ اُس کے دل کی لہر بیلوں سے آگے اُڑی جا رہی تھی۔ بیل پسینے پسینے ہو گئے اور وہ خود بھی جذبات کی گرمی انتظار کی بے چینی اور دھوپ کی حدت سے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ گیارہ کوس کا سفر تھا۔ کبھی موتیا تصورات کے رنگین جال میں الجھا رہتا اور کبھی بے چینی سے بیلوں کو ہنکاتا۔ سہ پہر بھی ختم ہوئی۔ سورج سونا بانٹتا ہوا افق مغرب کی طرف چلا۔ موتیا خیالات و تصورات کے ریشمی جامے بنتا ہوا گاڑی بڑھائے چلا جا رہا تھا ــــــ رادھا سیندور لگائے، ٹکلی سانے کھڑی ہے۔ رامو جلیبیاں کھا رہا ہے ــــــ رادھا مسکرائی، لجائی اور مدبھری آنکھوں سے کوئی نازک سا پیام دے کر کوٹھری میں داخل ہو گئی ــــــ

”پوں! پوں! پوں!۔۔ گھر! گھر! گھر! گر! گر! گر! غوں! غوں! گر! گر پوں! پوں! پوں! ــــــ“ ارے سالا! اندھا! ہٹا، تو نہ رے سالا ــــــ پوں! پوں!!“ موٹر ٹرک کے ہارن کی مسلسل آوازیں گالیوں سے ملی ہوئی فضا میں گونج رہی تھیں۔

——موتیا اپنے معصوم خیالات میں اب تک گم تھا——

——کھڑ دھڑ، زوں، دھک، دھک، دھاک، کھڑاک کھڑ کھڑ کھڑ۔ زوں زوں

دھک! چن چن چن چناک——اندھا سالا، پکڑو حرامزادے کو۔ ۔ ۔ ! گر سالا!

اُلٹ سالا اُلٹ ۔ ۔ ۔ ۔"

موٹر بیل گاڑی سے آکر ہلکے طور سے ٹکرائی، بھڑک گئے گاڑی ٹیڑھی ہو کر اونچی سڑک سے گرتی گرتی بچی مگر اولار ہو گئی۔ جو اوپر اُٹھ کر موٹر کے سامنے کے شیشے سے ٹکرایا، شیشہ چکنا چور۔ بیل سڑک کے نیچے اور موتیا قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے کھیتے میں جا گرا۔ ڈرائیور اور کلینر غصے سے لال پیلے، موٹر روک کر موتیا پر ٹوٹ پڑے قصور دونوں فریق کا تھا مگر کمزور ہی پر نزلہ گرتا ہے دونوں نے موتیا کو طمانچہ پر طمانچے مارے، گندی گندی گالیاں دیں اور لات مکا بھی کیا۔ چھین لو اندھے کے جنے کا دھوتی گمچھا سب" موتیا کو ایک لات لگاتے ہوئے ڈرائیور نے کلینر سے کہا گمچھا پھٹ گیا، دھوتی ڈھیلی ہو کر الجھ گئی اور گرہ سے بندھے ہوئے بارہ آنے پیسے جھولنے لگے "بہرا بیٹی۔ ۔ ۔ ۔" کلینر نے بیٹی کی گالی دیتے ہوئے کہا" سالے کے پاس پیسہ ہے۔ اس کی لنگا جھاڑی لیکر سب چھین لو۔ موٹر کا شیشہ ٹوٹ گیا اس کا دام کون دیگا" موتیا مسلسل پٹ رہا تھا۔ آخر کار اُس کے پیسے بھی چھین لئے گئے۔ بارہ آنے پیسے بس یہی اُسکی کائنات تھی۔ وہ بے حس کھڑا تک رہا تھا۔ جیسے اُس کے حواس سُن ہو گئے ہوں۔ ڈرائیور اور کلینر اُسے پیٹ پاٹ اور لوٹ کر چلے گئے۔ ٹرک روانہ ہو گیا اور سڑک کی اڑی ہوئی دھول موتیا کے سر پر پڑ کر اُس کا مضحکہ اڑا رہی تھی——

ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں گرے ہوئے سینڈور پر پڑ رہی تھیں چمبیلی کے تیل کی شیشی ٹوٹ چکی تھی اور جلیبیاں دھول سے اٹی ہوئی بکھری پڑی تھیں سینڈور کی سُرخی تھی یا موتیا کا دل خون ہو کر بہ گیا تھا۔ اس کے دل میں اتھاہ نفرت اور انتقام کے جذبات کھول رہے تھے وہ دنیا بھر کی موٹروں کو چور چور کر کے پھینک دینا چاہتا تھا۔ یک بہ یک اُسکے دل میں ایک خیال آیا ــــــ اور جو اس کے پاس ایک بہت بڑی ٹرک ہوتی، بہت بڑی، پر یتوں اتنی بڑی ــــ تو ــــ وہ ساؤجی کی سب موٹر ٹرکوں کے شیشے توڑ ڈالتا اور انہیں کچل کر رکھ دیتا۔

سورج ڈوب گیا اور اس کے خیالات شام کے دھندلکے میں ٹھٹکنے لگے۔ ارہر کے کھیتوں میں گیدڑ بولنے لگے کیسی بری تھی ان کی آواز مگر یہ ٹرک والے سب سے برے تھے۔

موتیا کو اب اپنی تمناؤں کی بربادی کا احساس ہوا۔ ہوتی، ساریاں، رادھا، رامو، ہمسائیاں، سوغات ؟ موتیا سر پکڑ کر رونے لگا۔

سینے ٹوریم کا فقیر

فکر و خیال کے لئے سب سے زیادہ موزوں وہ لمحات ہوتے ہیں جنہیں بیکار کہا جاتا ہے ان غیر آباد گھڑیوں کی بے کیفی کو دور کرنے کے لئے تخیل و تصور کی پریاں اپنے نازک اور رنگ برنگ پروں کے ساتھ آتی ہیں اور نو بنو نغمے گانے لگتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بھیانک خیالات کا دیو بھی اپنے ناخن و چنگاریاں کے ساتھ ہیبتناک دانتوں کو دکھاتا ہوا بڑھتا ہے اور سارے اعضاء و جوارح میں ایک لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔

برسات کی ایک اداس شام کو میں بیگانہ کار سینا ٹوریم میں بستر علالت پر لیٹا ہوا تھا، ایک بے رونق سی شام تھی جس میں نور سے زیادہ تاریکی کا عنصر تھا، محروم شفق، خاموش، بے کیف، دردِ خیز چمن بے رنگ سا معلوم ہو رہا تھا، باغوں میں گہری غمگین خیالات کو ابھارنے والی سیاہی نظر آ رہی

آ رہی تھی۔ پاگل ہاتھیوں کی طرح سیاہ بادل کے بڑے بڑے بے ڈول ٹکڑے آسمان پر ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور قسم قسم کی مہیب اشکال اپنے امتزاج سے بنا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس اندھی آنکھوں جیسی بے نور و رنگ شام کے بعد آنے والی اندھیاری رات اور ستم خیز ہوگی۔ ہوا شاید چل رہی تھی لیکن موت کی طرح غیر محسوس طور پر بے پاؤں ہاں فضا کی بلندیوں پر لکہ ہائے ابر کی حرکت سے ہوا کی حرکت کا ایک ہلکا سا احساس ہوتا تھا میرے منتشر خیالات و تصورات بھی موسم کے ہم آہنگ تھے جس طرح آسمان کی عریاں وسعتوں میں بادل کے مختلف الالوان ٹکڑے تیرتے پھرتے ہیں اور پھر ناگاہ ایک تختۂ وسیع کی صورت میں منضبط ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرے دماغ میں پریشان خیالات کبھی کبھی ایک منظم صورت اختیار کر لیتے تھے۔ کبھی میں زندگی کے گذرے ہوئے لمحات کا تصور کرتا، کبھی مستقبل کے خیال میں غرق ہو جاتا، اور کبھی حال کی کشاکش پر غور کرنے لگتا ماضی کی رنگینیاں رقص کناں آتیں اور دل میں ایک گداز پیدا کر دیتیں، آنے والی نامرادیاں بھیانک شکلیں اختیار کر کے مختلف ہیئتوں میں لرزہ خیز ناچ ناچتیں اور کبھی موجودہ مجبوریاں اور بیماریاں ایک مایوس کن اور رقت انگیز حلقۂ خیال میں مجھے گرفتار کر کے دلدوز ہنسی ہنستی ہوئی میرے سر پر چڑیلوں کی طرح سوار ہو جاتیں۔

اسی عالمِ درد و کوب، حزن و ملال میں دور کہیں سے گیت کی آواز آئی۔ نغمے کا زیر و بم تھرتھراتا ہوا میری روح میں پیوست ہوا جا رہا تھا میرے خیالات و تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا ایسی ویران شام میں موسیقی کی دلنوازی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس دنیا سے پرے بہت پرے کسی رومانی جزیرے میں، جو کسی ایسے کرے میں آباد ہے جہاں کی فضا شفقِ شام

تنویرِ صبح اور نورِ مہتاب کی آمیزش سے بنائی گئی ہے اور جہاں کے سمندر میں مدوجزر کی جگہ صرف نغمہ و موسیقی کا اتار چڑھاؤ ہے، کوئی لطیف ترین مخلوق، جس کی لطافت و شیرینی ہمارے بلند ترین قیاس سے بھی فزوں ہے، اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ ترنم ریز ہے۔ ماضی و حال و مستقبل سب اِس گیت میں گم ہو کر رہ گئے۔ میری ہستی بھی تھوڑی دیر کیلئے اِس سحرِ نغمہ میں فنا ہو گئی۔ میری کوئی حِس اگر باقی رہ گئی تو وہ سماعت تھی اور اگر کوئی خیال باقی تھا تو وہ نغمے کا خیال تھا۔

موسیقی محض موسیقی نے رفتہ رفتہ اپنی مثالی بلندیوں سے اتر کر صوتی تعینات کی قید اختیار کر لی اور اب میں معانی کے علاوہ الفاظ کے اظہار سے بھی متاثر ہو رہا تھا۔ وجدانِ ذوق کے ساتھ ساتھ اب عام حواس بھی کام کر رہے تھے۔ ہمارے وارڈ سے دور نرسوں کی اقامت گاہ میں گراموفون بج رہا تھا۔ گراموفون تو اور دن بھی بجتے تھے۔ لیکن نہ معلوم آج کون ساحر تھا۔ جو ایک نیا جادو جگا رہا تھا —— آواز آئی ——

روتے روتے انکھیاں بھیو لال رے سانوریا

کیسا درد خیز، سوگوار، دلگیر نغمہ تھا —— ! آہ کسی کی بڑی بڑی گریاں آنکھیں، میری آنکھوں کے سامنے آ گئیں، فلم کی تصویر کی طرح وہ سارے مناظر گھوم گئے جبکہ میرے انتہائی دورِ علالت میں میری پیاری بیوی دن کا دن اور رات کی رات میرے بستر سے لگی بیٹھی رہتی تھی، نہ جانے کتنی مضطر اور گریاں راتیں اُس نے آنکھوں میں کاٹ دیں۔ وہ رو رو کر میرے ساتھ سینا ٹوریم آئی یہاں رہنے کا کوئی سامان بھی نہ تھا، پھر بھی وہ والہانہ انداز میں میرا ساتھ دیتی رہی آخر کار

جب یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ مل سکا تو دل پر پتھر رکھنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی وہ مجبوراً چلی گئی۔ اُس سہ پہر کو جب وہ مجھ سے رخصت ہو رہی تھی ہم لوگ جدا ہونے کے متعلق کچھ نہ بولے محض معمولی گفتگو میں مشغول ہو کر اپنے جذبات کو بہلا رہے تھے۔ آخر وہ جدائی کی گھڑی آ ہی گئی۔ وہ رو پڑی ازمزم و کوثر اس کی محبت شعار آنکھوں سے جاری تھے یہی اُس کا آئینہ تھا اور بس وہ درختوں کے جھنڈ سے ہو کر جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئی وہ پھر پھر کر اُس ہرنی کی طرح دیکھتی جاتی تھی جو اپنے جوڑے کو زخم خوردہ پیچھے چھوڑ آئی ہو۔ وہ چلی گئی لیکن اپنے دل کی دھڑکن اور آنکھوں کی نمی میرے دل اور آنکھوں میں منتقل کر گئی اور جبکہ وہ مجھ سے کالے کوسوں دور ہے نہ معلوم اس کا کیا حال ہوگا ——— !

"روتے روتے انکھیاں بھیو لال رے سانوریا"

اس گیت میں جو معنوی و روحانی اضطراب اور بیکسی پنہاں ہے وہ مجھے بھی بیتاب بنا رہی تھی میرے خیالات کا ریکارڈ نہ معلوم کتنی دیر چلتا رہا۔ جب دماغ کی مشین ذرا رکی تو میں نے محسوس کیا کہ اس گیت کی صرف گونج باقی رہ گئی ہے اور فضا میں ایک دوسرا نغمہ ارتعاش پیدا کر رہا ہے بلتجیانہ آواز بھاری سی، مکرر

غریبوں پہ راکھو دیا بھلا ہوگا، بھلا ہوگا . . . . "

اس گیت نے میرے جذبات اور ذہن کو خاص طور سے اکسایا۔ سارے تصورات اور افکار محو ہو گئے، ساری بے چینی اور اضطراب مٹ گئے۔ میرے نہاں خانۂ دماغ کے کسی نامعلوم گوشے سے ایک دھندلی سی تصویر ابھرنے لگی، میلے کچیلے کپڑے۔ جھکا ہوا قد، ہاتھ میں لاٹھی لئے،

کپکپاتا ہوا سر برہنہ، بغل میں پھٹا پرانا ربوہ سا چھاتا، ایک بوڑھا فقیر میری چشم تخیل کے سامنے آگیا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دماغ کی ساری فضا میں سینا ٹوریم کا فقیر یہی گیت بکھیر رہا ہے۔

"غریبوں پہ راکھو دیا۔۔۔۔ بھلا ہوگا۔۔۔"

بھادوں کا مہینہ تھا۔ ابر کے سرشار گالے پُروائی کے ساتھ افق سے اُبھر اُبھر کر چھائے جا رہے تھے، تمام فضا بھیگی ہوئی تھی، درختوں کے پتوں پر سے رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا تنے بھیگ کر سیاہی مائل ہو رہے تھے، سبزہ شرابور ہو رہا تھا، تیز کپکپا دینے والی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی دیوانہ وار چل رہی تھی، رہ رہ کر پانی برس جاتا تھا، کبھی آہستہ کبھی موسلا دھار۔ سینا ٹوریم کی چاروں طرف سنسان تھا، آوارہ گرد کتے بھی کہیں چھپے چھپائے بیٹھے تھے، وارڈ میں مریض کالے کالے کمبل تانے پڑے ہوئے تھے، بات چیت بھی بند تھی، ہر طرف خاموشی تھی جو کسی بیمار کی کھانسی یا اس کے کروٹ بدلنے سے لوہے کی لچکیلی مسہری کی انفعالی چر چر سے ٹوٹ جاتی تھی۔ پُروا ہوا کی وحشیانہ ہاؤ ہُو نے ہر آواز کو محو کر دیا تھا۔ ایک بھیگی ہوئی اداس تاریکی دن کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی میں وارڈ کی پچھلی جانب سائبان میں اپنے بستر پر لیٹا لیٹا یا چپ چاپ نیم افسردہ و نیم مضمحل انداز میں پڑا تھا کہ سینا ٹوریم کا فقیر نانو ان لیکن کھردری آواز سے صدا لگاتا ہوا باغ کی طرف سے میرے سامنے والے دریچہ آنکلا۔ "کچھ دیدہ د بابا کچھ دیدہ د بابا" تھرتھرائی ہوئی، کمزور آواز تھی جسے موسم نے اور زیادہ افسردہ اور مضمحل کر دیا تھا۔ پر اس ملتجیانہ، خفیف و

زار صدا کی اثر خیزی دو چند سہ چند بڑھی ہوئی تھی۔ یہ معمر فقیر اکثر وارڈوں میں آیا کرتا تھا سینا ٹوریم کے قریب ہی ایک بستی تھی وہیں کا یہ رہنے والا تھا۔ جب سے سینا ٹوریم کا قیام ہوا تھا وہ یہاں آکر بھیک مانگا کرتا تھا۔ میں تو سینا ٹوریم میں نو وارد تھا۔ پر اِسے وارڈوں میں چکر لگاتے کئی بار میں نے دیکھا تھا اور اکثر اس بوڑھے فقیر کو پیسے بھی دیتے تھے لیکن آج نہ معلوم کیوں اس کے چہرے بشرے سے ایک غیر معمولی خستگی آشکارا تھی، ویران، خشک، دہشت زدہ صورت جھریاں زیادہ بھیانک ہوگئی تھیں۔ اُس کے گال اور پیشانی ایک جتے ہوئے لیکن غیر آباد کھیت کی طرح تھے۔ جھریوں کی ہر تحریر میں صدہا المناک اور غم خیز افسانے مرتسم معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے ریکارڈ کی تحریروں میں اندوہگیں گیت بند ہوں سینا ٹوریم کے مریضوں کی کراہ اور موت کے وقت ان کے عزیز کی گریہ زاری شاید فقیر کے چہرے کی جھریوں سے لپٹ کر رہ گئے تھے فقیر کی آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے، گہرے، سنسان، خوفزا، جیسے کوئی آسیب زدہ اندھا کنواں ہو۔ اُس کی آنکھوں سے ایک خاص قسم کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اگر تاریکی سے شعاعیں نکلتی ہیں تو اُس کی آنکھیں ایسی ہی تاریکیوں کی مخرج بنی ہوئی تھیں۔ اسکی نگاہوں سے بیکسی، سوگواری، اداسی برس رہی تھی۔ فرقت زدہ دلوں کی تیرگی، ہجر کی سیاہ راتوں کی تاریکی مایوس مریضوں کی اداسی، غربت کی بیگانگی، افلاس کی سیہ بختی، بوڑھے، خمیدہ کمر، لرزاں فقیر کی آنکھوں سے نکل کر میرے دل میں کھبی جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کی حرکت سے زندگی کی شور بختی اور ناسازگاری کے واقعات، تمناؤں کی محرومی کے حادثات، اجل کی چیرہ دستیوں کے سانحات میرے قلب پر اس طرح منعکس ہو رہے تھے جیسے کسی المیہ قصے کے فلم سے تصویریں پردہ فلم

پر منعکس ہوتی ہیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا، ناتوانی کی کپکپی سے سردی کی تھرتھری نے مل کر اُسے ہمہ تن لرزشِ مسلسل بنا دیا تھا۔ اُس نے پھر اپنی کھوکھلی آواز میں صدا لگائی۔ ایک ایسی آواز جیسی ہوا کے گذرنے سے رخنہ در قبروں اور مقبروں کے شکستہ گنبدوں سے پیدا ہوتی ہے

"با . . . . با . . . . کچھ . . . . . دو۔ دو۔ و . . . . . بھ . . . لا . . . . ہو . . . . . گا . . . . . !" بوڑھا فقیر بیٹھ گیا، اپنی لاٹھی اُس نے سرِ راہ دروازے کے سامنے اپنے پہلو کے قریب رکھ لی۔ وہ تھکا جا رہا تھا۔ نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان کر آیا تھا۔ اس کے بوسیدہ سراسر پیوند لگے ہوئے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ ایسے موسم میں کیوں باہر نکلے ہو۔ اس نے ایک ایسی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جیسے کوئی مرنے والا نزع کے وقت سانس لینے کی آخری کوشش کرتا ہو، جواب دیا کہ آج اُسکی رفیقِ زندگی کی برسی کی نیاز کا دن ہے اور اُسے بستی میں ایک پیسہ بھی نہیں مل سکا۔ لہٰذا وہ سینیٹوریم کی طرف نکل آیا ہے۔ وہ بیٹھا ہوا تھا، پھر بھی اُسکی گردن اور سر مختلف زاویوں میں ہل رہے تھے۔ اس کا میوں جیسا جھری دار، خشک، سیاہی مائل زرد ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا چھاتا بغل کے اندر دبائے ہوئے تھا . . . . وہ خاموش ہو گیا۔ اُس سے زیادہ بولا نہ جاتا تھا۔ میں نے اُسے خوب غور سے دیکھا اور بٹوے سے ایک اکنی نکال کر اُسکے آگے پھینک دی۔ اُس نے اُسے استعجاب سے دیکھا اور پھر خوش ہو کر کچھ زیرِ لب بڑبڑایا۔ وہ میری طرف اور سرک آیا اور جوشِ مسرت میں مجھ سے اِس طرح گفتگو کرنے لگا جیسے وہ مجھے اپنا ہمدرد اور ہمدم سمجھتا ہو۔ اُس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور اس کے اعضا کی تھرتھراہٹ اور بڑھ گئی، جیس طرح

ابر آلود آسمان پر سیاہ بادلوں کے درمیان کبھی شگاف پیدا ہو جانے سے کوئی تنہا روشن ستارہ نظر آجاتا ہے۔ اسی طرح اس کی نگاہوں کی تاریکی کے درمیان آنسو کا ایک ڈھلکتا ہوا قطرہ چمک رہا تھا۔ وہ مخاطب تو مجھ ہی سے تھا لیکن اس کی نگاہیں کہیں دور بے خودانہ انداز میں جمی ہوئی تھیں۔ میں بوڑھے فقیر کی طرف ایک غیر معمولی کشش محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا نہایت ہی محو ہو کر میں اسکی باتیں سننے لگا۔ اس کے لہجے میں درد تھا۔ ایک ایسا درد جو برسوں کسی وفادار محبت شعار سینے میں پرورش پا چکا ہو۔ اس نے مجھے سنایا کہ پانچ سال قبل آج ہی جیسا طوفانی موسم تھا، بوڑھا فقیر اور اسکی بوڑھی رفیقِ زندگی بھوک سے مجبور ہو کر بھیک مانگنے نکلے۔ گھروں کے دروازے بند تھے، راستے بھی ویران، اکا دکا اگر کوئی نظر آبھی جاتا تو اس بے برگ و نوا جوڑے کی طرف بغیر توجہ کئے گذر جاتا، اور ان کی صدائیں بادِ تند کے جھونکوں کے ساتھ بغیر اثر پیدا کئے اڑ جاتیں۔ ان دونوں نے ساری بستی کی خاک چھان ماری ہر گلی میں چکر لگائے ہر دروازے پر صدا لگائی لیکن ان کی کسی نے مدد نہ کی غضب کی سردی تھی، بھیگی برسات، ٹھنڈی سطح مرتفع پر چلنے والی تند ہوائیں اس پر قلتِ خوراک، نہ کپڑا نہ لتّہ بوڑھی فقیرن کو نمونیا ہو گیا اور وہ تیسرے روز مر گئی، بوڑھا فقیر اتنا کہہ کر رونے لگا۔ میں خاموش تھا۔ وہ پھر بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ اس نے کہا کہ "میں بھی مر جانا چاہتا ہوں۔ . . ." اس کی آواز نحیف تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خاموش ہو رہا۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے گردن اٹھائی اور ایک خاص جوش کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہنے لگا، کہ "میں ایک کسان ہوں، لوگوں کے کھیت بٹائی پر جوت کر اپنا پیٹ پالتا ہوں، میرا باپ بھی کسان تھا اور بوڑھی فقیرن کا باپ بھی" جیسے بجھتی ہوئی شمع دمِ آخر بھڑک اٹھتی ہے ویسے ہی اس کی آواز گرم تر و تیز تر ہو گئی۔ وہ کہنے لگا کہ لڑکپن میں ہم دونوں اسی جنگل میں جہاں اب

سینا ٹوریم ہے بکریاں چرایا کرتے تھے اور ساتھ کھیلتے تھے۔ پھر ہم لوگوں کی شادی ہوئی اور بچے ہوئے ہمارے دو بیٹے جوان ہو گئے تھے۔ وہ کھیتی باڑی میں ہماری مدد کرتے تھے۔ گاؤں میں ہیضہ پھیلا اور وہ دونوں مر گئے"۔ بوڑھے فقیر کی آواز رُکنے لگی۔ اُس کے چہرے پر یادِ ماضی کے آثار سے رنج و غم کی علامتیں ملکر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ اب وُہ زار زار رو رہا تھا، کہنے لگا بچے مر گئے ہم دونوں بوڑھے ہوتے گئے، اب محنت کر کے پیٹ پالنا بھی دوبھر ہو گیا۔ کاش بچوں سے پہلے ہم مر جاتے۔ لیکن قسمت میں دربدر مارے مارے پھرنا لکھا تھا"! سینا ٹوریم کے فقیر نے اپنا افسانہ حیات مجھے سنا دیا اور تھک کر زمین کیجانب بےمعنی طور پر تکنے لگا۔ اس کی نیم وا آنکھوں سے قطرہ ہائے اشک بہہ بہہ کر اُس کے میلے گودڑ پر ٹپک رہے تھے، اُس کی جھکی ہوئی گردن اور جھکی جا رہی تھی۔ اُس کی تیز تیز سانس سے ملی ہوئی ایک زیرِ لب کراہ کی سی آواز نکل رہی تھی۔ ٹھیک اُس وقت دوشِ ہوا پر ایک وسیع لکہ ابر جھوم کر اٹھتا ہوا سر پر آ گیا اور کچھ کچھ پھواریں پڑنے لگیں۔ سینا ٹوریم کا ڈاکٹر گھومتا ہوا آ نکلا۔ اُس نے بوڑھے فقیر کو دیکھ کر وارڈ کے ملازموں کو ڈانٹ بتائی کہ اُسے سینا ٹوریم میں کیوں آنے دیا جاتا ہے۔ فقیر نکال دیا گیا۔ پانی زور زور سے برسنے لگا۔ فقیر نے اپنا چھاتا کھولا اور کانپتا، ٹھٹھرتا ہوا چل دیا۔ بارش ہو رہی تھی، ظالم ہوا ہڈیوں کے اندر تک پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ فقیر بھیگ رہا تھا۔ آہ اس کا چھاتا! وُہ تو اُس کے افلاس کا پھریرا معلوم ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے دھجیاں نکلی آ رہی تھیں، ہوا انہیں اڑا رہی تھی اور جو کافی بھیگ گئی تھیں، اُن سے پانی ٹپک ٹپک کر فقیر کے جسم کو تر کر رہا تھا اور پرت لوہے کی ٹوٹی تیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طوفان زدہ کشتی کے بادبان کی طرح ہوا کے تیز جھونکے سے چھاتا قلا بازیاں کھا کر فقیر کے ہاتھ سے چھوٹ کر اڑ گیا۔ باورچی خانے

سے چھوکروں نے یہ منظر دیکھا اور تالیاں بجا کر خوب ہنسے۔ کونے کا نرس سوئے ہوئے کتے اُٹھ بیٹھے اور غریب فقیر پر بھونکنے لگے۔ سامنے ایک بڑا سا بڑ کا درخت تھا، اُس کے سائے میں جا کر وُہ کھڑا ہو گیا۔ شاید انسانوں سے زیادہ فراخ حوصلہ اور نفع رساں یہ باوقار اور حلیم درخت ہوتے ہیں۔ وُہ کھڑا کھڑا سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا، اُس کی سفید داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وُہ کانپ رہا تھا اور اُس کے ساتھ ساری کائنات کانپ رہی تھی۔

دوسرے دن یہ خبر ملی کہ سینیٹوریم کا فقیر مر گیا۔

کسی ٹوٹے ہوئے دل کی آخری آہ کی طرح اُس کے زار و نزار جسم سے روح نکل گئی ہو گی

ٹن! ٹن! ٹن! ٹن!!!! شام کی استراحت کا گھنٹہ ختم ہو چکا تھا۔ برقی قمقمے بھک سے جلا دیے گئے، مریضوں نے کھانسا، کروٹیں بدلیں اور اُٹھ بیٹھے۔ اب بھی نرسوں کے کوارٹر میں گراموفون بج رہا تھا۔ مجھے ابھی تک برقی روشنی کے درمیان سینیٹوریم کے فقیر کی آنکھوں کی تاریک شعاعیں رقص کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں، اور وہ درخت کے نیچے اُس کی آخری ہیکسانہ کپکپی!!

مریض

"خدا ایک حقیقتِ مطلق ہے اور "مطلقیت" کے لحاظ سے عیب و صواب کا تصور لایعنی ہے "بھلائی" اور "برائی" محض اضافی الفاظ ہیں مگر انسانیت کے لئے خدا اور کائنات کی اضافی حیثیت ہی حقیقت کبریٰ ہے کیونکہ ہم عرش کی سطح سے نہیں دیکھ سکتے اور خدا کی طرح "محسوس" کرنے سے قاصر ہیں ——"

یہ تھے وہ الفاظ جو میں نے جاوید کے روزنامچے کے ایک صفحے پر پڑھے۔ میرا عزیز دوست جاوید عرصے سے بیمار چلا آتا تھا۔ آج میں اُس سے ملنے گیا تھا۔ اُس کے سرہانے چند کتابیں اور ایک کھلی ہوئی ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ پاس "فاؤنٹین پن" اس انداز سے پڑا تھا کہ اُسے لکھتے لکھتے یوں ڈال دیا گیا ہو۔ جاوید سے باتیں کرتے ہوئے میں نے مندرجہ بالا تحریر پڑھ لی اور چونکہ ہم لوگ بے تکلف

دوست تھے۔ میں نے ڈائری اٹھا کر پوری تحریر پڑھنی چاہی۔ مگر جب جاوید نے دیکھا کہ میں اس کا روزنامچہ اٹھا کر پڑھنا چاہتا ہوں تو اس نے ایک ہلکے شرمیلے پن سے یہ کہتے ہوئے ڈائری خود اٹھالی کہ ——

"بہت سی باتیں دل سے ایسی کی جاتی ہیں جن کے متحمل دوسرے لوگ نہیں ہو سکتے۔"

میرے پندار کو ٹھیس لگی، میں نے جواباً کہا

"یا تم دوسروں کی نکتہ چینیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

جاوید کے جذبات کو ایک ہلکی سی چوٹ آئی، اس نے منفعل ہو کر جواب دیا۔

"ٹھیک کہتے ہو، ہم میں سے بڑے سے بڑا صاف گو بھی اپنے مصلحانہ دعووں کے باوجود گلے گلے کہنے کے قابل باتوں کو بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ سماج میں انوکھے بننے کے "حیاتیاتی" نتائج سے غیر ارادی طور پر کانپ اٹھتا ہے۔ اس کی یہ غیر شعوری جھجک خود حفاظتی کے لئے بڑے کار آمد ہے ——"

"تو کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں" جاوید نے مجھے ڈائری دیتے ہوئے کہا۔ "روزنامچہ اٹھا لینا محض ایک فطری ردِ عمل تھا یہ ایک انعکاسی حرکت تھی جیسے تمہاری انگلیوں کے قریب آنے سے میری پلکوں کا جھپک جانا۔"

میں نے ڈائری لیکر ایک آدھ صفحہ پڑھا اور اس کے بعد جاوید خود مجھے جگہ جگہ سے سنانے لگا اسے تسکین ہو رہی تھی۔ اس کی روح کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ خیالات و واردات کا بھی بوجھ ہوتا ہے

مندرجہ ذیل واقعات جاوید کی ڈائری سے ماخوذ ہیں مگر میں پہلے آپ سے اسکا تعارف

تو کرا دوں۔

جاوید ایک ذکی الحس شاعر تھا اور آغازِ شباب میں اُسے مصوری کا شوق بھی رہا تھا اور کچھ دنوں تک ڈرامانگاری اور اداکاری سے بھی شغف تھا۔ وہ اسکول اور کالج میں نہایت نمایاں رہا۔ تقریر بھی اچھی کر سکتا تھا اور اس سلسلے میں اُسے کئی تمغے بھی ملے تھے۔ یہ سب ایک بلند اور تخلیقی فطرت کی سعیٔ اظہار تھی۔ جاوید تربیتاً مذہبی تھا اور فطرتاً اخلاقی۔ مذہب سے علمی واقفیت بھی رکھتا تھا۔ اُس کی تعلیم بھی کچھ عجیب طرح ہوئی تھی۔ میٹرک کے بعد دو سال سائنس کا طالب علم رہا اور اُس کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ یوں تو وہ جنم کا روگی تھا۔ مگر یہاں اس پر سِل کا حملہ ہوا اُسے تیسرے سال میں آ کر ترکِ تعلیم کرنا پڑی۔ اُس کے حوصلوں کو سخت دھکا لگا مگر اُس نے سپر نہیں ڈالی۔ دو سال تک نرا دیہاتی بنا رہا۔ کھیت کھلیان اور سیر و شکار بس یہی اسکا مشغلہ تھا۔ اُس کی صحت بحال ہو گئی اور اُس نے میڈیکل کالج کو چھوڑ کر بی اے میں نام لکھا گیا اسی دور میں اُس نے محبت کی اور اُس سے محبت کی گئی۔ شاید یہ محبت ہی کا اعجاز تھا کہ وہ ایک خطرناک بیماری سے شفا یاب ہو گیا۔ وہ کسی کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ رہنے کی شدید خواہش اکثر ضامنِ حیات ثابت ہوتی ہے۔ بی اے کے دوسرے سال میں اس کی شادی اپنی "پرستیدہ تمنا" سے ہو گئی۔ جس طرح زلزلے کی تباہ کاریوں کے بعد آفت رسیدہ لوگ ازسرِنو مکانات تعمیر کر کے رس بس جاتے ہیں۔ ویسے ہی جاوید بھی اپنے ارمان و تمنا کی سوکھی ہوئی بیلوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے انگریزی ادب میں آنرز کے ساتھ اعلیٰ نمبروں سے بی اے پاس کیا مگر دورانِ امتحان میں اس پر اُس کے پرانے مرض کا شدید حملہ ہوا اور جب نتیجہ نکلا

تو وُہ اس حال میں تھا کہ اس کی زندگی موت سے برسرِ پیکار تھی۔

جاوید کو سینا ٹوریم بھیج دیا گیا۔ حیات کے لئے انسان کو اکثر اپنے اوپر موت طاری کرنی ہوتی ہے۔ زندگی کی قیمت زندگی ہی ہے۔ سینا ٹوریم ایک سطح مرتفع پر واقع تھا۔ زندگی کے ہنگاموں سے دور۔ تہذیب کی نبض یہاں دھیمی بہت دھیمی محسوس ہوتی تھی۔ اونچے ٹیلوں اور شاداب و ساکن جنگلوں کے درمیان اسپتال تھا۔ سل ودق کے مریضوں سے بھرا ہوا۔ جاوید کو ہلنے جلنے کی ممانعت تھی۔ وُہ مہینوں اس طرح پڑا رہا ہے جیسے حنوط شدہ لاش۔ مگر وُہ محسوس کرتا تھا اپنے دکھوں کو دوسرے کے دکھوں کو، شکستِ تمنا کو، مٹتی ہوئی صلاحیتوں کو، سسکتی ضائع ہوتی ہوئی زندگی کو، دم توڑتی ہوئی انسانیت کو۔ اور وُہ محسوس کرتا تھا تقدیر کو، اعمال کو اور خدا کو۔

جب اُسے اُٹھنے بیٹھنے کی اجازت ملی تو اُس نے اپنی دکھی اور بیمار زندگی کو کتابوں کے کھلونے دیکر بہلانا چاہا۔ وُہ پہلے بھی علم ہیئت، علم کیمیا، حساب، علم الادویہ، تشریح، حیاتیات، افعال الاعضا، معاشیات، اور ادب و انتقاد کالجوں میں پڑھ چکا تھا اور شوقیہ اُس نے فلسفہ و نفسیات، مذہبیات کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ سینا ٹوریم میں وہ ادبیات، جنسیات اور اخلاقیات سے اُلجھتا رہا۔ اُس نے لینن کی سوانح حیات بھی پڑھی۔ وُہ کتابوں میں سکون کی تلاش کرتا تھا اور اُسے ہیجانِ دماغ و اضطراب دل حاصل ہوتا تھا۔ وُہ جبر و قدر کی گتھیاں سلجھاتا، جزا و سزا کے متعلق رائے زنی کرتا، موت کے بعد آنے والی زندگی کے تصور میں غرق رہتا۔ کبھی انسانیت کے نشہ میں چور ہو جاتا اور انقلاب کا ڈنکا پھونکنا چاہتا اور کبھی وہ رومان کے رنگین و خواب آسا جزیروں میں کشتیٔ ہلال پر سوار ہو کر جاتا اور وہاں شاہدانِ سیم تن کے مشک افشاں گیسوؤں سے کھیلتا۔

پھر وُہ دور آیا کہ جاوید نے ساری کتابوں کو یہ کہہ کر پرے پھینک دیا کہ ـــــــ "ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولٰے!" اب اُسے بڑی طرح زندگی کی محسوس حقیقتوں کی پیاس تھی۔ اسکے اندر زندہ رہنے کی بے پناہ خواہش اُبھر آئی۔ وُہ چاہتا تھا کہ ہر لمحہ اپنے نفس کو یقین دلائے کہ وُہ زندہ ہے۔ وہ اپنی روح کو زندگی کا، انصالِ جسم و جان کا، اپنے ہر عضو، اپنے ہر قوے اسے ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اس کی صحت بھی ترقی کر رہی تھی۔

صنفِ مقابل زنگار ہے۔ جب یہ زنگار زندگی کے شیشہ میں لگ جاتا ہے۔ تو ہم اُس میں اپنی خودی کو دیکھتے ہیں۔ مرد اپنی مخفی و جلی صلاحیتوں کو اُس وقت تک رُو برو نہیں دیکھ سکتا جب تک اُسے اُس نازک و سریع الحس "برق پیما" کا توسط حاصل نہ ہو جائے، جسے عورت کہتے ہیں اور سینا ٹوریم میں یہ صنف پائی جاتی تھی نرسوں کی شکل میں وہ نرم خو ہمدرد، آغوش کشا دخترانِ کلیسا۔ کبھی جاوید کی پیاری بیوی . . . . اُس کی چشمِ تصور کے سامنے انگشتِ انتباہ بن کر کھڑی ہو جاتی اور اُسے جھرجھری سی آجاتی مگر اُس کیسا تھ کتنی محرومیاں اور بدنصیبیاں وابستہ تھیں اس کی بدقسمت شریکِ حیات کی اور کنبہ والوں کی ـــــــ جاوید ان باتوں کو بھول جانا چاہتا تھا وُہ شراب پی کر مدہوش ہو جانے کا آرزومند تھا۔ وُہ ہر اُس چیز سے بھاگنا چاہتا تھا جو اُسے "عشرتِ نشہ" سے محروم کر کے "اذیتِ خمار" میں مبتلا کر دے۔ اُن ہی دنوں عید آئی مگر جاوید ہلالِ عید سے آنکھیں چار کرنے سے ڈرتا تھا۔ اُس کے تصور میں ہلالِ عید اُس لب کی طرح تھا جو طنز کرتے وقت کج و خمدار ہو جاتا ہے۔

مگر کبھی ان خود فراموشیوں کے درمیان گھر سے آیا ہوا کوئی خط کشیدہ کڑھے ہوئے رومال یا تکیہ کے غلاف جاوید کے تخیل کو ماضی کی حدود میں دھکیل دیتے تھے اور وُہ شب کی تنہائیوں میں خاموش آنسوؤں کے موتی مقدس یادوں کے مندر پر چڑھاتا اور وہاں ایک دیوی محبت کی غمگینی سے زیر لب مسکراتی ہوئی براجمان ہوتی اُس کے جذبات دیوی کے قدموں پر سجدہ ریز ہو جاتے اور پھر اُسے خدا یاد آتا۔ رحم و قدرت کے عرش پر متمکن۔ وُہ بیتاب ہو ہو کر دعائیں کرنے لگتا۔ نہیں معلوم کیا کیا۔ اس حالت میں اُسے نیند کی مہربان آغوش میں سکون، وقتی سکون حاصل ہو جاتا۔

جاوید ان ہی کیفیات میں مبتلا تھا کہ اُس کی بیوی اُس سے ملنے سینا ٹوریم آئی۔ وُہ اس انہونی کی طرح جیسے پانی کے چھینٹوں سے جگایا جائے، جاگا مگر ایک اعصابی کرب کے ساتھ۔ شاہینہ اُس ویرانے میں مہینوں ٹھہری ایک ٹوٹے پھوٹے سنسان مکان میں جاوید اور شاہینہ روز ملتے تھے، شاہینہ جاوید کی گمراہیوں کیلئے داروئے شفا بن کر آئی اور یہی وجہ تھی کہ وُہ گاہے گاہے اُس سے لڑ پڑتا تھا۔ اُس مریض کی طرح جو زخم دھلنے کے وقت چیختا ہے۔ شاہینہ نے، اُس یوگی کی طرح جو اپنی تپسیا سے پرمیشور کی دیا کو جیت لیتا ہے، جاوید کی فریفتگیوں کو پھر ایک بار اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ لق و دق صحرا میں بھٹکتا ہوا مسافر جیسے قندیل رہبانی سے راہ پاتا ہے۔ ویسے ہی جاوید شمع محبت کی روشنی سے ہدایت پا گیا۔ مگر اس نور میں زخم ہائے حوادث زیادہ صاف طور پر دکھائی دینے لگے۔ وُہ مغموم رہنے لگا۔ نیکیوں کے ساتھ ایک مقدس مغمومیت لازمی ہے۔ اب وُہ رو بہ صحت ہو رہا تھا۔ سینا ٹوریم کی آب و ہوا اکثر مسیحائی کر جاتی ہے۔ اس پر مستزاد وقت کی پابندی، مقوی غذا اور کافی سے زیادہ آرام۔ جاوید اب حقیقی زندگی اور فرائض کے بار کو اپنے تخیل میں تول رہا تھا۔ اُف فرض کا خیال

بھی کتنا وزنی ہوتا ہے اور اگر فرض کے خیال کے ساتھ امید کی روشنی نہیں ہوتی تو یہ کتنا روح فرسا ہو جاتا ہے!

جاوید کے دل میں بھی امید کی روشنی نہ تھی مگر وُہ قطعی مایوس بھی نہ تھا۔ بلکہ اُس پر ایک بیحسی سی طاری رہتی تھی اور یہ بے حسی ارادی تھی ——— دراصل اُس کے نفس میں ایک کشاکش تھی بیم و رجا کی۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کیلئے اُس کے نفس نے کروٹ لی بیحسی کا خاتمہ ہو گیا اور اب وُہ ڈرامانگاری و اداکاری میں غرق تھا۔ آرٹ کی تخلیق یا تو وسعت و انبساط کے عالم میں ہوتی ہے یا تحدید و پابندی کی حالت میں۔ وُہ فطرتیں جو ایک دنیا سے سیر ہو جاتی ہیں دوسری دنیا کی تخلیق کرتی ہیں اور وُہ فطرتیں بھی خالقِ فن ہوتی ہیں جو اس دنیا کی محرومیوں سے تنگ آ کر عالمِ نو کی تعمیر پر مجبور ہوتی ہیں سینا ٹوریم میں اور بھی چند نوجوان تھے جو کم و بیش اسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے ایک مجلسِ ڈرامہ قائم ہو گئی اور خاص اہتمام کے ماتحت ڈرامے کھیلے جانے لگے۔ جاوید ناظم تھا، اداکار تھا اور ڈرامہ نویس۔ نرسوں نے بھی ڈرامے کھیلے اور اب وُہ بیمارستان اپنی باشندہ آبادی کے لئے رومانستان تھا۔

شاہینہ واپس جا چکی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد جاوید پر افسردگی طاری رہنے لگی وُہ اپنی نئی مشغولیت میں بھی شاہینہ کو بھول نہیں سکا۔ وُہ بالکل صحتیاب ہو چکا تھا۔ موسم بھی اچھا تھا لہٰذا جاوید سینا ٹوریم کو خیر باد کہہ کر وطن روانہ ہو گیا۔

اب جاوید وطن میں تھا جو ڈیڑھ سال کی غریب الوطنی کے بعد ایک ایسا فردوس معلوم ہو رہا تھا جس کی بازیافت ہوئی ہو اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وُہ ڈیڑھ سال تک ایک خواب دیکھتا رہا ہے، ایک ایسا

خواب جس میں غمناکیاں زیادہ تھیں اور مسرتیں کم۔ اُسے وطن کا ذرّہ ذرّہ مہرِ درآغوش معلوم ہو رہا تھا اور وُہ محسوس کرنا چاہتا تھا کہ وُہ کبھی بیمار نہیں تھا۔ اُس کے لئے زندگی زیادہ روشن، زیادہ پُر معنی ہوگئی تھی۔ وُہ ماضی و مستقبل کو بھول کر صرف "حال" کو دوام بخشنے کا آرزومند تھا مگر آفتاب نصف النہار پر کبھی نہیں رہ سکتا۔ فریبِ خیال بھی حقیقت کے سامنے بکھر جاتا ہے۔ جاوید کو کچھ دنوں کے بعد اپنی محرومیوں اور حدبندیوں کا احساس بری طرح ہونے لگا۔ "تم مریض ہو! مریض ہو! دُنیا کی وسعتیں تمہارے لئے بند ہیں، یہ عارضی صحت ہے۔ تم مریض ہو!" یہ آوازیں اُس کے کان میں آتیں۔ وہ پاگل ہو جاتا! ایک اضطراب، ایک ہیجان، ایک شورش اُس کے دماغ میں پیدا ہوتی اور وُہ چاہنے لگتا کہ "زمانہ" کے جگر کو چھید کر رکھدے، ماضی کے اثرات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے اور تقدیرِ خداوند تقدیر کو معطل کر دے وُہ اُن حدود کو بھی توڑ دینا چاہتا تھا جن کے اندر وُہ معمولی حالت میں رہنا پسند کرتا۔ بے عملی اس کے لئے ناممکن تھی۔ وہ مختلف مشاغل میں منہمک رہنے لگا اور رفتہ رفتہ اُس کے دل میں اعتماد پیدا ہونا شروع ہوا۔ یہ امید کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے قبل تو وُہ امید کرنے سے بھی ڈرتا تھا جیسے کوئی چشمِ چشم کا مریض آفتاب کی کرنوں سے خوف کھائے مگر جب آنکھیں اچھی ہونے کو آتی ہیں تو کمرے کی کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں اور پھر سنہری دھوپ کی طلب ہوتی ہے۔ تقدیر جاوید کے ساتھ تھی۔ اور اُسکی صحت بہت اچھی طرح قائم۔ اُس کے دل کی کھڑکیاں بھی کھلنے لگیں اور اُس کے اندر امید کی کرنیں داخل ہو رہی تھیں۔ جاوید اب آشا کی روشنی میں اپنی زندگی سدھارنے کا متمنی تھا۔

اُس نے ایم اے کی تیاری شروع کر دی اور شریکِ امتحان ہو کر نہایت شاندار طور پر ایم اے پاس بھی کر لیا۔ اُس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اُسے میدانِ عمل مل گیا تھا اور مستقبل میں نئی وسعتیں

اس کی جولانگاہ بننے والی تھیں۔ ان دنوں وہ سرگرم عمل تھا۔ وہ علم و ادب کی خدمت میں مشغول تھا اور معاش کی تلاش بھی کر رہا تھا۔ آخر الذکر امر میں اُسے ناکامی پر ناکامی ہوتی۔ بعض نوکریاں اُسے اِس لئے نہیں ملیں کہ وہ سینا ٹوریم سے واپس آیا ہوا مریض تھا۔ جاوید کی امیدوں کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ وہ کشتیٔ شکستہ کی طرح بے سہارا ہو جاتا اگر ادب کی جل پری اُس کی محبوبہ نہ ہوتی۔

ابتلاء و آزمائش جاوید کے لئے مقدر تھی۔ وہ عروس ادب کے گیسوؤں سے کھیل ہی رہا تھا کہ یک بہ یک اس پر وجع المفاصل کا شدید حملہ ہوا۔ درد و اضطراب کے عذاب میں وہ ایک ماہ تک مبتلا رہا۔ جوڑ جوڑ میں درد، بند بند میں سوزش، وہ بستر پر جنبش کرنے سے بھی قاصر تھا۔ وہ "درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری" کی تفسیر تھا۔ دکھ، بیکلی اور خوف اس پر ہر وقت طاری رہتے موجودہ مرض کا عذاب اور گذشتہ بیماری کے اعادہ کا خوف جاوید کیلئے سوہانِ روح ہو رہا تھا اُس کے لئے رات اور دن یکساں تھے۔ کیونکہ مارے درد کے سو نہیں سکتا تھا۔ بخار سے بھنا ہوا زندگی کا ایک مکروہ سوانگ بنا وہ بستر پر سکڑا سکڑایا، کراہتا، چیختا پڑا رہتا۔ بے آس، مضطرب، مضمحل، وہ گھلتا جا رہا تھا۔ جلتا رہا تھا، فنا ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی ہستی ایک دردناک کراہ بنکر فضا میں گم ہو جائے گی۔ اُس کا چہرہ بعض اوقات شدید طور پر مشتعل نظر آتا۔ اُس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں اور وہ غیر واضح طور پر بڑبڑاتا ہوا سنائی دیتا

شاہینہ ایک وفا سرشت ہستی تھی۔ اُس کا دل یکسر سوز و گداز تھا محبت کرنے کے بعد اُس کے اندر ایک خاص نوع کی الوہیت پیدا ہو گئی تھی اور یہی اُس کی مصیبتوں میں کام آئی۔ شادی نام تھا اس کے لئے ابتدائے آلام کا۔ لیکن دکھوں کو اُس نے ایک تیاگی کی طرح برداشت کیا۔

وہ سینا ٹوریم کے ویرانوں میں مہینوں جاوید کے لئے جوگن بنی رہی اور اب بھی وہ زاہد شب زندہ دار کی طرح اُس کی خدمت میں مشغول تھی لیکن جاوید گاہے گاہے شاہینہ کی خدمتوں سے چڑ جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہینہ ایسی نہ ہوتی۔

ایک ماہ کی اذیتوں کے بعد جاوید اچھا ہونے لگا۔ صحت اور بیماری کے درمیان کا عرصہ بھی کافی وسیع تھا۔ وہ بہت لاغر ہو گیا۔ زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے سے زیادہ عاجز۔ وہ ابھر رہا تھا کہ اُسے پھر مٹایا گیا۔ اُس کے دل میں ایک خاموش خلفشار اُمڈ رہا تھا۔ وہ اپنی روح پر مذہب و اخلاق کے بندھنوں کو کمزور پا رہا تھا۔ وہ ایک بے اُمید، بے مستقبل انسان تھا۔ تقدیر کے تلون کا شکار۔ امید نہ ہو تو ایمان کی بقا معلوم۔ اُس کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ اُس کے اعمال کے پیچھے کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔ وہ ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ بغیر کسی تمنا کے بغیر کسی خوف کے۔ وہ خدا کو بھول جانا چاہتا تھا کیونکہ خدا کو بُرا کہنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ لیکن بعض اوقات اُس کی مذہبیت اُبھر کر اُس کے نفس کو فرض کی طرف متوجہ کرنا چاہتی۔ پھر ایک تاریکی پیدا ہوتی اور اُس کی روح پر چھا جاتی اُس تاریکی میں سے کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا کہ " اعمال کی سزا صرف اس لئے ہے کہ انسان صاحب ارادہ ہستی ہے مگر ارادہ خدا تو نہیں کہ بغیر سبب کے پیدا ہو جائے۔ ارادہ خود مخلوقِ اسباب و علل ہے۔ جن پر انسان کا کوئی قبضہ نہیں، پھر جزا و سزا کیا؟ اور اگر ارادہ خود خدا ہے تو نتیجہ ایک ہی ہوا۔ ارادہ نفس کی ایک کیفیت ہے اور کیفیت اندرونی کیمیاوی اور برقی تغیرات، نیز بیرونی تحریکات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ناقابل تسخیر غیر شعوری قوتوں کے سامنے ارادہ کی بے بسی روزمرہ کا مشاہدہ و تجربہ ہے۔ ارادہ ہمارے افعال و اعمال پر حاکم نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود ارادہ نفسِ تحت الشعور کا غلام ہے

اور اس تحت الشعوری قوت کی تخلیق زمانہ اور ماحول کرتا ہے"۔ اس آواز پر جاوید زیادہ کان دھرتا ان ہی دنوں اُس نے سیاسیات اور اشتراکیت کا مطالعہ شروع کیا۔ اُس کے لکھے ہوتے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں زیادہ نظر آنے لگیں۔ باوجود مجبوری و معذوری پر ایمان لانے کے وُہ سارے نظام سے بغاوت کرنی چاہتا تھا اور خدا سے بھی۔ مگر آخر الذکر امر کی اُس میں تاب نہ تھی۔ اُس پر اُس دور میں اور بھی مصائب آئے اور بیکاری کی مصیبت ولعنت ان پر مستزاد۔ جاوید کا خاندان معاشی تنگی میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اُن ہی پریشانیوں میں اُس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں نے اُسے تبدیلئ آب وہوا کا مشورہ دیا اور وُہ تنہا ایک صحت افزا مقام کو چلا گیا۔ روپے کی تنگی کے سبب وُہ ایک نہایت ہی معمولی مکان میں ٹھہرا۔ وُہ مسکن مکان سے زیادہ ایک جھونپڑا تھا۔

—— جاوید کی زندگی اُن دنوں ایک سادھو کی سی بسر ہو رہی تھی۔ وُہ اپنی کٹیا سے باہر اگر نکلتا بھی تھا تو جنگل کے متصل میدان میں۔ اور رات کو آسمان کی چھت کے نیچے کھاٹ پر پڑا رہتا۔ اُس کا ایک وفادار مقامی ملازم اُس کے پاس سوتا تھا۔ ماحول کا اثر طبیعت پر بہت پڑتا ہے۔ فضا کی معصومیت جاوید کی روح میں سرایت کر رہی تھی۔ وُہ اپنے اندر ایک پاکیزگی محسوس کرتا تھا۔ وُہ اپنے نفس میں تیاگ کی کیفیت کو بیدار کرتا ہوا پاتا تھا۔ وُہ مقام آبادی سے بہت دور تھا۔ ہر طرف فطری مناظر تھے اور کھیتوں کا ابدی سکون، فطرت کی آغوش میں جاوید ماں کی محبت کی قسم کے ایک روحانی فیض کا تجربہ کر رہا تھا۔ اُس کے ذہنی و روحانی زخم مندمل ہو رہے تھے۔ حیات کی کامرانیوں اور ناکامیوں کو وُہ یکساں "مایا" سمجھنے لگا تھا۔ یہ احساس اُسے وجدانی طور پر ہوا اور اُسے ایک روحانی بصیرت بخش گیا اور ایک آسمانی مسرت۔ مئی کی ایک گرم دوپہر کو جاوید

اپنے جھونپڑے میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ یک بیک اُس کے دل پر رقت طاری ہوئی اور وہ رونے لگا اور خوب رویا۔ پھر وہ اُٹھا اور خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ عرصہ سے اُس نے نماز ترک کردی تھیں۔ اب وہ نہایت خلوص سے قائم الصلوٰۃ ہو گیا۔ یہ قابلِ رشک زندگی وہ بسر کرنی چاہتا تھا کہ شاہینہ اور جاوید کے چند عزیز گھر سے آئے۔ جاوید کو مکان تبدیل کرنا پڑا۔ وہ پہلے تو بہت خوش ہوا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ اسکا سکون لٹتا جا رہا ہے۔ دُنیا پھر اُس کے پاس آگئی تھی اور جاوید کے لئے دُنیا کے پاس گیا تھا۔ محرومی ہستی اور بیماری!

دوسرے مکان میں جا کر جاوید کی رگِ مقابلہ پھڑک اُٹھی۔ وہ دُنیا کی ہر شے سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور زندگی کے اصول وضوابط میں ایک ایسی تبدیلی کا آرزو مند تھا جس میں اُس کیلئے کوئی جگہ ہو۔ وہ موت وحیات کے آئین کو یکسر بدل دینا چاہتا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شاہینہ سے اور اپنے اعزا سے بات بات پر اُلجھنے لگا۔ جا و بے جا اُسے جوش آجایا کرتا۔ اُسکی روح آثارِ حیات کی سُرخی و رونق کو قریب پا کر آمادۂ پیکار تھی۔ دُنیا اُس کیلئے خطرے کا نشان تھی

جاوید صرف ایک دو ماہ کے لئے برائے تبدیلِ آب و ہوا اس جگہ آیا تھا مگر اُسے یہاں چار ماہ رہنا پڑا۔ وہ یہاں صحت کی ترقی کیلئے آیا تھا مگر اُسے حرارت رہنے لگی۔ ڈاکٹروں کو باعثِ حرارت کا پتہ نہ چلا۔ کبھی سل کے زخموں کے ہرا ہو جانے کا شبہ ہوتا اور کبھی وجع المفاصل کی تحریک کا۔ طبی مشورے کے ماتحت اُسے زیادہ وقت پلنگ پر گذارنا پڑتا۔ سیر کی اُسے مطلقاً اجازت نہ تھی۔ دوائیں بھی بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ جاوید نہایت صبر وضبط سے اس سزا کو برداشت کر رہا تھا اُس کے اعزا واپس چلے گئے تھے۔ صرف شاہینہ رہ گئی تھی۔ وہ اکثر شاہینہ سے بیزار رہتا اور

نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی مگر وُہ ان دنوں خدا سے بیزار نہ تھا۔ وُہ صبر و رضا کی تصویر بننی چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کے اندر اُٹھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتا تھا اور روک رہا تھا۔ سیلاب کی راہ میں رکاوٹ شدید کف پیدا کر دیتی ہے۔ جاوید کا مزاج کف آلود ہو رہا تھا۔ اُس کی فطرت کی سطح پر سنجیدگی، خشونت، طنز اور استہزاء کا کف اُٹھتا رہتا تھا۔ شاہینہ رنجیدہ تھی کہ جاوید اُس سے بہیمانہ برتاؤ کیوں کر رہا ہے اُسے توقع نہ تھی کہ وُہ ایسا بے درد ہو جائے گا۔ مگر وُہ ایسا ہو گیا تھا۔ اس کی فطرت کی لطافت اس طرح غائب تھی جیسے جیٹھ کے مہینہ میں کھیتوں سے سبزی مفقود ہو جاتی ہے۔ شاہینہ رونے لگتی۔ جاوید بہت دیر تک بے حسی سے اُسکے رونے کو دیکھتا رہتا اور کچھ تلخ و تند باتیں کہدیتا۔ شاہینہ ایک آئینہ تھی جس میں جاوید اپنی بے دست و پائی، دست نگری، نکھٹوپن کی شبیہہ دیکھتا تھا اور جھلا کر اُس شیشہ ہی کو توڑے دیتا تھا جس میں ایسی بُری شکل نظر آتی تھی۔ یہ آئینہ اُس کی خودی کا مُنہ چڑا رہا تھا۔

اسی طرح مہینے گذر رہے تھے۔ برسات آئی اور وُہ ساری سطح مرتفع دیوانہ وار چلنے والی سرد و تند ہواؤں کی بازی گاہ بن گئی۔ ایک روز زوروں کی بارش ہوئی جھڑی تو بہت دنوں سے لگی ہوئی تھی ہر طرف نمی تھی فضا ابر آلود ہو رہی تھی۔ بارش جو ذرا تھمی تو جاوید قریب کی بستی کی طرف چلدیا۔ ایک ہفتہ عشرے سے اُسے ٹہلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ وُہ رو بصحت تھا۔ ان دنوں اُس پر ایک مذہبی کیفیت طاری تھی۔ وہ مقامی جنگلی اقوام کے افراد کو مذہب کی تبلیغ کرنے گاؤں گیا تھا۔ راہ میں اُسے بارش نے آلیا اور واپسی کے وقت وُہ بھیگتا ہوا آیا۔ دوسرے روز اُس نے تمام جوڑوں میں درد محسوس کیا اور پھر اُسے شدید بخار آگیا۔ وُہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔

اسی بخار و درد کی حالت میں دست بدست و بگیے و پا بدست دیگرے وُہ وطن کو لوٹ آیا اور شہر کے جنرل اسپتال میں داخل ہو گیا۔ وُہ کیف رضا و صبر کی حالت میں اِن اللہ مع الصابرین کی لذت کو محسوس کر رہا تھا اور اپنے اندر ایک بالیدگی پا رہا تھا۔ ہرچند کہ وُہ اسپتال میں تھا۔ پھر بھی وُہ خوش تھا تبدیلی اکثر باعثِ مسرت ہوتی ہے۔ یہاں اُس کے دوست احباب آ کر اُس سے مل جاتے تھے اور اس کا غم ہلکا ہوتا رہتا تھا۔ دو دن کے بعد اُس کا بخار اُتر گیا تھا اور درد رفع ہو چکا تھا۔ وُہ سمجھ رہا تھا کہ ایک دو ہفتہ میں وُہ اچھا ہو جائیگا اور آزادی سے ہر جگہ جا آ سکے گا۔

ٹھیک چودھویں روز اُس نے پھر جوڑوں میں درد محسوس کیا اور اُسے حرارت ہو گئی۔ ڈاکٹر آیا اور اُس نے دل کا معائنہ خاص طور پر کیا۔ "درد و حرارت زائل ہونے کے بعد بستر پر تین ماہ کامل آرام" ڈاکٹر نے سینہ پر سے اسٹتھیسکوپ اُٹھاتے ہوئے کہا "کل سے وجع المفاصل کا انجکشن لینا شروع کرو۔" ڈاکٹر چلا گیا اور جاوید پر بجلی سی گری۔ اُس نے اپنے چند دوستوں سے جو میڈیکل کالج میں اُس کے ہم جماعت تھے اور اب ڈاکٹر ہو چکے تھے۔ پوری کیفیت دریافت کی ہرچند کہ اُن لوگوں نے اُسے بہت تسکین دی مگر وُہ اتنا تو سمجھ گیا کہ وجع المفاصل کے مزمن ہو جانے سے اُس کے قلب کی پہلی حرکت کمزور ہو گئی ہے اور عضوی اختلال کا خوف ہے۔ اُس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اُس کا دماغ کچھ سوچنے سے ڈرتا اور اُس کا دل محسوس کرنے کے فرض سے گریز کرتا تھا اور اُس کی آنکھیں آنسو بہانے سے قاصر تھیں۔ دن بھر وُہ اسی حالت میں پڑا رہتا اور رات کو مریضوں کی کراہوں کے درمیان جاگتا رہا۔ صبح کو آفتاب نکل رہا تھا مگر اُس کی زندگی کیلئے کوئی روشنی نہیں تھی۔ اُسے اپنی علالت کے سات طویل سال ایک تاریک رات کی طرح

محسوس ہو رہے تھے جس میں کبھی کبھی بجلیاں کوندی تھیں۔ اُسے دو ایک قدم آگے بڑھانے کے لئے اُس کے انجام کی طرف اور وہ انجام اب آگیا تھا ـــــ زندگی شکن عمیق غار! موت کا خیال آتے ہی اُس کے سارے جسم میں ایک خوفناک جھرجھری دوڑ گئی۔ کوئی سہارا نہیں! کوئی آسرا نہیں!! اور اگر وہ زندہ بھی رہا تو ایک مجہول اپاہج دُکھی زندگی بسر کرنے کے لئے۔ اس کی صلاحیتیں فنا کی جائیں گی۔ اُسے سسک سسک کر کراہتے ہوئے بیماری کی قید میں دم توڑنا ہوگا۔ یہ صبر و ضبط، یہ ہمت اور ارادے، یہ استقلال و امید سب!! حاصل!! اسپتال میں اس کے چاروں طرف زندگی کا شور تھا۔ مگر روگی جیون کا، دُکھی زندگی کا "سارکوما" کے مریض گھل گھل کر مر رہے تھے ہر طرف درد و غم تھا۔ ہر سو آہ و بکا تھی۔ اس کے پلنگ کے سامنے ایک نمونیہ کا روگی تین روز سے حالت نزع میں تڑپ رہا تھا موت کا وحشیانہ رقص اور اُس کے دلدوز قہقہے فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ حیات سسک رہی تھی۔ درماندگی و ہلاکت کے پنجے پھیلے ہوئے تھے۔ اور مسرت منہ چھپا کر گریہ کناں تھی جاوید اسی طرح موت کی بازیگاہ میں ایک ماہ پڑا رہا۔ اُس کا مرض کابوس کے بھوت کی طرح اُس کے سینہ پر سوار تھا۔

اِس روح فرسا ماحول سے اکتا کر جاوید اپنے ایک عزیز کے مکان میں منتقل ہو گیا جس روز وہ جا رہا تھا۔ ایک سگ گزیدہ اسٹریچر پر اُسکے وارڈ میں لایا گیا۔ اُسکا آخری وقت تھا۔ وہ وہیں زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، سر دھن دھن کے اور اپنے جسم کو ناخنوں اور دانتوں سے مجروح کرتے ہوئے مر گیا۔ جاوید کی روح پیچ و تاب کھانے لگی۔ اور اُس نے زیرِ لب کہا "انتقالِ روح کا کتنا حیوانہ طریقہ!" ایک بدقسمت بندہ اپنے آقا سے بیزار تھا

جس مکان میں اب جاوید تھا۔ وہیں شاہینہ بھی تھی۔ ان دنوں وہ شاہینہ کو نہایت ہی ترحم کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ شاہینہ تو سر بسر گریہ تھی۔ اُس کی نمازیں ایک طویل فریاد ہوتی تھیں۔ جاوید میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی جسے وہ محسوس کرتی تھی۔ جب کبھی بھی جاوید کو درد کی ٹیس اُٹھتی۔ اُس کا چہرہ غیض و غضب سے تمتما اُٹھتا مگر اُس کے لب خاموش رہتے۔ ایک اندرونی جذبہ اُس کی روح کو کھا رہا تھا۔ اگر اُس کی ڈائری نہ ہوتی تو اس جذبہ کی حقیقت سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے جس کے خلاف یہ تھا۔

"انسانوں کی یہ وسیع آبادی ایک وحوش خانہ ہے۔ جہاں جانور صرف اسلئے رکھے جاتے ہیں کہ اُنہیں "تماشا گاہ" میں ایک دوسرے کا خون پلوا کر ہلاک کیا جائے۔ قیاصرۂ روم خدا کے نقال تھے خوردبینی کیڑے ادنیٰ و اعلیٰ جانور اور انسان اس "تماشا گاہِ ہستی" میں ایک دوسرے سے جنگ کر کے خدا کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے، اور اپنے لئے موت کماتے ہیں۔ ان کی پرداخت بھی صرف اسی لئے کی جاتی ہے۔ یہ امراض کے حملے اور جرم کشی، یہ شکار، ذبح اور جانوروں کا انسانوں کو کاٹنا اور پھاڑ کھانا، یہ وطنی قتال، حق و باطل کی آویزشیں، یہ رنگ و نسل کے جھگڑے سب خونیں تماشے ہیں جن کی کل خدا کے ہاتھ میں ہے اور آخرت! کون جانے جسے مذہب خیرِ کُل سمجھتا ہے۔ وہ شرِ کُل ہو اور اجرِ غیر ممنون محض وعدۂ فردا! یہ ہیں جاوید کی ڈائری کے الفاظ۔ معاذ اللہ! اس کی روح اُس کے جسم سے زیادہ بیمار تھی!

ایک روز جاوید کے جوڑوں میں شدید درد اُٹھا۔ اُس کی گردن مارے درد کے تڑخ رہی تھی بخار بھی تھا۔ شاہینہ اُسے منہ دھلانے آئی اور اُسے کروٹ پھرانے لگی۔ جاوید کی گردن میں ٹیس اُٹھ

رہی تھی۔ وہ کروٹ پھیرنے سے عاجز تھا جب بھی گردن کو جنبش دیتا۔ رگ اور پٹھے میں ٹیک پیدا ہو جاتی۔ یک بیک اُس کی رگیں تن گئیں، اور چہرہ پر گرم خون تیزی سے دوڑ گیا۔ اُس نے اپنی گردن کو جھٹکتے ہوئے کروٹ پھیری اور بولا ''اُف ظالم خدا!'' یہی جملہ بہت دنوں سے اُس کے قلب میں گھٹ رہا تھا۔ اُسے جراتِ اظہار نہ تھی۔ اعلانِ کفر بھی شہادتِ ایمان کی طرح ہمت طلب ہے۔ شاہینہ حیرت و غم کے سمندر میں ڈوب رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اُس کی آنکھیں مسترحمانہ انداز میں کہہ رہی تھیں ''جاوید!''

پہلے تو جاوید کی خودی کو تسکین ہوئی لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اس نے ایک چٹان کو سرکا تو دیا مگر وہ چٹان اُس کے سر پر آ گئی اور اُسے پیسے ڈالتی ہے اس پر ایک پسپا سپردگی اور ایک مظلومانہ بے توجہی کی کیفیت طاری رہی اور شاہینہ بادہ کانپ رہی تھی۔ گھلی جا رہی تھی اور اُس کی دعائیں زیادہ گریہ در آغوش ہوگئی تھیں۔ جاوید کو بستر سے اُٹھنے تک کی اجازت نہ تھی بستر ہی اُس کی ساری کائنات تھی۔ اور وہ کیسی تاریک تھی! وہ اپنے چاروں طرف ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔ ایک لامتناہی خلا۔ اُس کے دل میں بھی ایک خلا تھا۔ خارجی خلا سے زیادہ ہیبتناک، زیادہ ناقابل الفہم، زیادہ بے معنی۔ اس کے لئے زندگی کا کوئی اثباتی مقصد نہیں تھا بے کیف لاحاصل، رائیگاں زندگی! کوئی ہاتھ اُس کے دل کو تسکین دینے والا، کوئی لب اُسکی رُوح کو محبت کا پیغام پہنچانے والا نہ تھا۔ ہر طرف ایک مہیب اور بھیانک خاموشی تھی۔ ہر سو سر پھری، جاوید ایک مجہول بھائیں بھائیں کرتی ہوئی تاریکی میں غرق تھا۔ زندگی سے زیادہ تلخ اور موت سے زیادہ خوفناک تاریکی۔ وہ اس بے پایاں ابدی تاریکی میں دھنسا جا رہا تھا۔ اور تاریکیاں اس

پر گہری ہوئی جاتی تھیں۔

شاہینہ ان تاریکیوں کو دیکھ رہی تھی اور لرز جاتی تھی۔ وہ جاوید کے جسم و روح کی نجات کی متمنی تھی۔ درد انگیز شدت کے ساتھ۔ مگر وہ مجبور رہتی، بکسر مجبور! ایک روز وہ دعا و عبادت سے فارغ ہو کر جاوید کے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرہ پر ایک قدوسی نور تھا۔ اور اُسکی آنکھیں امید کی تابانی سے چمک رہی تھیں۔ اُس نے محبت و شیرینی کے ساتھ جاوید سے کہا "آپ کبتک اپنے مالک سے روٹھے رہیں گے" جاوید کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ خود خدا کی آواز تھی۔ جو اُسے پکار رہی تھی۔ اُس نے اپنے قلب میں بھی اُس کی بازگشت سُنی ——— "آپ کب تک اپنے مالک سے روٹھے رہیں گے" محبت کی ایک پکار کے ساتھ جامد خاموشیاں مٹ چکی تھیں۔ تاریکی چھٹ رہی تھی۔ اور وہ اپنے اندر اور باہر نور کی فاتح کرنوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی روح خدا کی پکار کا جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں دے سکتی تھی۔ اُس کے حلق میں دعائیں اٹک رہی تھیں۔ اور اس کی پلکوں پر آنسو تُل رہے تھے۔ شاہینہ بولی "دعا کیجیے! میری خاطر دعا کیجیے!" جاوید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اُس کے لب ہل رہے تھے۔ مہر ٹوٹ چکی تھی۔ برف پگھل چکی تھی! جاوید و شاہینہ دونوں رو رہے تھے۔ اور دعا و التجا کے اہتزاز سے انکے لب کانپ رہے تھے۔ شاہینہ نے جاوید کے سر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور جاوید کا ہاتھ اُس کی گردن میں حمائل تھا۔

——— اور خدا کی محبت کا ہاتھ اُن پر سکوں کی بارش کر رہا تھا۔

یہ دُنیا

”چھی! یہ کمینے شور کتنا کرتے ہیں۔ دن بھر تو خیر سے بدذات دُور دفان رہتے ہیں مگر شام ہُوئی نہیں کہ بھیڑ بکریوں کی طرح آدھمکے اور آدھی رات تک غدر مچائے رکھتے ہیں۔ اس جیسا پڑوس تو کسی کا نہ ہوگا۔ میں اس مکان میں رہنے کی روادار نہیں . . .“ نوجوان راشدہ نے اپنے میاں سے چیں بر جبیں ہو کر کہا۔

میاں نے تھوڑی سی ہاں میں ہاں ملائی اور دبی زبان سے عذر بھی پیش کیا ——— ”سچ کہتی ہو۔ یہ نیچ لوگ جانور ہیں جانور۔ بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ لیکن اِن کو اب کوئی کیا کہے۔ آج کل تو شرافت نبھانی بھی مشکل ہے۔ اِن نچلے طبقے کے لوگوں کے منہ لگنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔“

”تو میں کیا کروں؟ وہ کوٹھری تو جیسے شہر بھر کے لچے لفنگوں کا اڈا ہے۔ اُن کے ساتھ ملکہ

میں بھی روزانہ رتجگا مناؤں؟ ــــــ مجھے آپ میکے کیوں نہیں بھیج دیتے۔ دن بھر اکیلی سڑتی رہوں اور رات کی رات سر کا بھیجا کھلواؤں؟ ــــــ" راشدہ نے چڑ کے کہا۔

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں بھئی کوشش کر دوں گا۔ کل منشی جی سے ان حرامزادوں کو کہلواؤں گا . . ." مولوی امجد علی نے دب کر جواب دیا اور کنجیوں کا جھبا لیکر مردانے میں اپنے آفس کی طرف چلے گئے۔

مولوی امجد علی رجسٹریشن کے محکمے میں انسپکٹر تھے۔ بڑے باوضع آدمی۔ گھر پر اُنکا رعب تھا۔ برادری میں عزت تھی۔ محلے میں کیا شہر کے اکثر شرفا میں اُن کا نام اونچا تھا۔ سرکار سے خان بہادری کا خطاب مل چکا تھا۔ لیکن بیوی سے ذرا ڈرتے۔ پچاس سے کچھ اوپر کا سن تھا۔ صحت اچھی تھی اور خضاب کی مدد سے اور بھی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ پندرہ پندرہ سال کی رفاقت کے بعد یکے بعد دیگرے دو بیویاں مر چکی تھیں۔ راشدہ تیسری تھی۔ شادی کو ابھی دو سال ہوتے تھے۔ گھر میں بال بچے، نوکرانیاں، ماماتیں، ملازمین، خدمتگار، اچھا بڑا سا کنبہ تھا۔ راشدہ بیس سال کی اچھے ناک نقشے والی سانولی رنگ کی عورت تھی۔ اُسے دیکھ کر عام طور پر ایسا احساس ہوتا تھا۔ جیسے پکے ہوئے سیب یا بھری ہوئی بوتل کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہ حسین سے زیادہ نوجوان تھی۔ اُسے شادی کے فوراً ہی بعد خانہ داری سنبھالنی پڑی۔ آخر مولوی امجد علی نے شادی اسی لئے کی تھی نہ کہ گھر دیکھنے والا کوئی نہیں۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو چکیں اور وہ اپنے سسرال میں تھیں۔ اب اتنے بڑے گھر کا کارخانہ کیسے چلتا۔ لڑکے کالج میں پڑھتے تھے۔ اور وہ خود اکثر دورے پر ہی رہتے۔ راشدہ نے آتے ہی گھر گرہستی کا بوجھ اُٹھا لیا۔ اِس نئے تجربہ سے

اُسے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اب وہ مکمل عورت تھی۔ اس کی ہر جگہ اہمیت اور منزلت تھی۔ راشدہ خوش مزاج تھی، زندہ دل اور صحبتوں میں ہنستے بولنے والی۔ وہ التزام کے ساتھ برادری کی ہر تقریب میں شریک ہوتی۔ بلکہ مولوی امجد علی کے سبھی ہم چشموں کے گھروں پر خوب خوب ملنے ملانے جایا کرتی۔ وہ ہر جگہ ملنسار اور خلیق مشہور ہو گئی۔ مولوی امجد علی بھی خوش تھے۔ کہ اُن کی نئی دُلہن خوب رس بس گئی ہے۔

مولوی امجد علی گھر پر کم رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ قصباتی رجسٹری آفسوں کے ملاحظہ کیلئے دورے کرتے رہتے تھے۔ گھر پر جب آتے تو فائلوں کا انبار۔ مگر فرصت کے اوقات میں وہ اپنے اہل کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تعلیم پانے والے لڑکوں سے پوچھ گچھ اور بیوی سے ہنسنا بولنا اور فرض کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ بیوی بھی ایک ڈیڑھ سال تک نہایت ہی اطاعت مندی کا ثبوت دیتی رہی تھی۔ مگر اِدھر چند مہینوں سے راشدہ چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ اکثر وہ مولوی امجد علی کو سخت سُست بھی کہہ دیتی۔ اور وہ اُسے پی جاتے۔ مولوی امجد علی کو تعجب تھا کہ راشدہ ایسی کیوں ہو گئی ہے اور گھر کے سارے لوگوں کو حیرت تھی کہ "خان بہادر" سا رعب دار آدمی بیوی سے ڈرنے لگا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ کنبہ کو دو بیویوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ تو انوکھی بات تھی کہ سرکار کے سامنے کوئی زبان ہلائے۔ مولوی امجد علی نے ابتدا میں یہ سمجھنا چاہا کہ اُن کی نئی دُلہن شاید امید سے ہوں، ایسی حالت میں عورتیں ذرا چڑچڑی ہو جاتی ہیں۔ وہ خوش ہوئے اور اُن کے مردانہ پندار کو تسکین سی ہوئی۔ لیکن راشدہ کو یہ آسرا نہ تھا۔ جس کی بنا پر ممکن تھا اس کا چڑچڑا پن دور بھی ہو جاتا۔ خان بہادر اِسی خیالِ خام کے ماتحت

سب کچھ سہتے گئے اور رفتہ رفتہ ان پر راشدہ کا رعب غالب ہوگیا۔ وہ راشدہ سے کترانے لگے دورہ پر سے واپس آکر بھی وہ مردانہ میں ہی رہتے اور فائلوں میں غرق۔

راشدہ ایک سال تک تو اپنی شادی شدہ زندگی کی منزلت کے کیف میں ڈوبی رہی۔ مگر خودی کی تسکین کے بعد جوانی نے اپنا خراج طلب کیا اور یہ ادا نہ ہوسکا۔ شباب بپھر گیا۔ لیکن قیدخانہ کی دیوار سے سر ٹکرانے کے علاوہ اور کیا چارہ تھا۔ جوانی کے مطالبے جب نہ پورے ہوئے تو راشدہ نے خودی کو کمک پر بلایا اور ملنے ملانے، تحفہ تحائف اور زینت و آرائش پر خوب وقت اور روپیہ صرف کرنا شروع کیا۔ کچھ دنوں کے لئے شباب شکست کھا گیا۔ مولوی امجد علی خاصے ایبر تھے۔ لیکن ہاری ہوئی، دبی ہوئی جوانی چھپ چھپ کر طرح طرح کے حملے کرتی ہے۔ راشدہ کا چڑچڑا پن بھی اسی امڈی مگر محصور جوانی کی جھاگ تھا۔

خان بہادر کے عالیشان مکان کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں کا سلسلہ تھا درمیان میں کوٹھی کا احاطہ اور ایک لانبی سی گلی حائل تھی۔ ان مکانوں کی بساط بس اتنی تھی۔ ایک چھوٹا سا برآمدہ اور اس سے لگی ہوئی ایک یا دو شکستہ حال کوٹھریاں۔ ایک دو مکان ایسے بھی تھے۔ جن کے عقب میں کھنڈر سی انگنائی تھی اور ٹوٹی پھوٹی چاردیواری۔ لانبی گلی کے اندر مسلسل سات آٹھ پخانوں کی صفائی کے راستے کھلتے تھے۔ جن پر محض عذر کے لئے لکڑی کا اکھڑا ہوا ڈھکن یا سڑی ہوئی کواڑ کے آثار لگے ہوئے تھے گلی کے ایک پہلو میں از کار رفتہ نالی دوڑ گئی تھی، جیسے پھولی ہوئی، سیاہ، بیمار و بیکار کوئی رگ ہو۔ نالی کیچڑ اور گندے پانی سے بھری ہوئی رہتی تھی۔ اور کبھی گلی کی سطح پر بھی پانی پھیل جاتا تھا۔ بوسیدہ مکانوں کے سامنے کوڑوں کے ڈھیر بھی رہتے تھے۔ اور ان ڈھیروں

کی آرائش کے لئے ٹوٹی ہوئی ہانڈیاں اُن کے سیاہ پیندے، پھوٹے ہوئے گھڑے اور اُن کے کنکھیوں کے دائرے، پھپھوند لگی ہوئی پیلی اجلی دال، ٹین کی پرانی زنگ آلود ڈھبری اور سیاہ چیتھڑے ہوتے تھے۔ ایک سیاہ کتا اکثر کوڑے کے ڈھیر کو اِس طرح انہماک کے ساتھ کریدتا رہتا تھا۔ جیسے آثارِ قدیمہ کا انکشاف کر رہا ہو۔ ان ہی مفلوک الحال مکانوں کے درمیان ایک چیز تھی جسے مشکلوں سے کوٹھڑی اور آسانی سے بھوسا وغیرہ رکھنے کی جگہ کہہ سکتے تھے۔ دو چھپروں اور فرسودہ دیواروں کے درمیان ایک تاریک خلا سا اور بس۔ یہ خلا گلی کے بالکل ہم سطح تھا۔ اور نالی کے کنارے۔ اس پر لوہے کے پتروں کا ایک جافری نما پھاٹک لگا ہوا تھا۔ روشنی سے آنے والی آنکھوں کو یہ خلا محض ایک بڑا سا تاریک دھبہ نظر آتا تھا۔ کچھ دیر میں جب نظریں ذرا مانوس ہو جاتی تھیں تو اس تاریکی کے اندر سے مبہم شکلیں ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پانی سے چپ چپ سی کچی زمین اور بھس بھسی سی نم دیواریں۔ یہ کوٹھری سی جگہ بالکل اندھی تھی۔ دیواروں میں کوئی شگاف تک نہیں۔ کوٹھڑی کے حاشیوں پر کچی مٹی کے چولھے تھے۔ دن بھر یہ چولھے بھائیں بھائیں اپنے بھوکے منہ پھاڑے رہتے تھے۔ چھپر کی ٹھاٹ سے بندھی ہوئی کچی اونچی الگنیاں تھیں جن پر پھٹے پرانے کپڑے یا دبلی دبلی گٹھڑیاں ٹنگی ہوئی رہتی تھیں۔ کوٹھڑی کے کونوں میں لپٹی ہوئی چٹائیاں اور وسط میں بکھرے ہوئے برتن باسن ——— پیتل کے لوٹے، مٹی کی ہانڈیاں اور چپت اکھڑے ہوئے تامچینی کے قاب ———

اِس کوٹھڑی میں بھانت بھانت کے لوگ رہتے تھے۔ سب دور دراز کے گاؤں سے آئے ہوئے پیشہ ور، مزدور، اور پھیری والے۔ اکثر یہ لوگ دن بھر غائب رہتے۔ کبھی کبھار کوئی اِکا دُکا

مزدور کوٹھری میں چٹائی پر لیٹا ہوا یا کچھ کام کرتا ہوا پایا جاتا۔ کوئی غلہ اور سبزی کی آڑھت میں قلی کا کام کرتا تھا۔ کوئی کوئلہ پھیری کر کے بیچتا تھا۔ کوئی چینیا بادام اور ایک پیسے میں آٹھ ملی کا خوانچہ لگاتا، کوئی چٹائی بنا کر بیچتا اور کوئی رکشا کھینچتا تھا۔ شام ہونے ہی کے بعد بگڑے وہ کوٹھری آباد ہونا شروع ہوتی۔ مزدور تھکے ہارے آکر چولھا جوڑتے مصالحہ پیستے اور کھانا پکاتے تھے۔ دن بھر میں بس ایک بار صبح کو کبھی باسی بھات بچ رہتا اور اُسی پر گذارا ہو جاتا۔ اندھیری کوٹھری دھوئیں سے اٹ جاتی تھی اور مزدوروں کی آنکھوں میں پانی آجاتا مگر وہ آگ پھونکتے رہتے۔ اِن مزدوروں کے چولھے الگ الگ جلتے تھے۔ سب کی ذات علیحدہ، لہٰذا سب اپنا بھات بھی جدا جدا پکاتے تھے۔ تاریک کوٹھری کے اندر مختلف چولھوں کی آگ کی روشنی میں بیٹھے ہوئے مزدور غول بیابانی سے معلوم ہوتے تھے۔ یہ زور زور سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ سویرے ہی کھانے پینے سے فراغت کر کے یہ منڈلی خوب شور وغل کرتی، گیت گاتی، گالیاں بکتی، قہقہے لگاتی، لڑتی جھگڑتی، قصے کہانیاں کہتی، روز کے گذرے ہوئے واقعات پر لمبے لمبے تبصرے کرتی اور پھر بھجن بھی گاتی۔ غرض اس کوٹھری کے لوگ محلے بھر کو سر پر اٹھائے رکھتے تھے۔ کبھی جو یہ مزدور پی پلا کر آتے تو اور غضب ہو جاتا فحش کی بھرمار اور کھلی ہوئی گالیاں۔ شام سے لیکر آدھی رات تک قیامت مچی رہتی۔

خان بہادر مولوی امجد علی نے شہر میں زمین خرید کر نیا مکان بنایا تھا۔ اس محلہ میں اور بھی معززین نے اسی طرح بڑے بڑے مکانات بنائے تھے مگر ابھی تک محلہ میں زیادہ تر غریبوں کے مکانات ہی تھے۔ خان بہادر کے سونے کا کمرہ دوسری منزل پر مزدوروں کی کوٹھری کے سامنے پڑتا تھا۔ اِن فرسودہ مکانوں کے سلسلے کے پرے ایک بڑا سا کھلا ہوا میدان تھا یہ

میدان کبھی کھیت تھا اور اب فٹ بال گراؤنڈ کے کام آتا تھا۔ سونے کا کمرہ دوسرے کمروں کی نسبت اِسی سبب سے زیادہ ہوادار تھا، مگر یہ رات کی رات شورِ قیامت۔

راشدہ نے پہلے تو اِس روزمرّہ کے ہنگامہ کا کوئی خاص خیال نہ کیا تھا۔ مگر اب جب کہ اس کا مزاج اکثر مکدّر رہتا یہ شور و غل اُس کے لئے عذاب تھا اور جب یہ طوفانِ بدتمیزی مولوی امجد علی کے ہوتے ہوئے ہوتا تو راشدہ اور جل جاتی۔ اُسے غصہ اُتارنے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ آج اُس کوٹھری کے مزدور حسب معمول شور کر رہے تھے۔ کہ مولوی امجد علی سونے کے کمرے میں آنکلے جہاں راشدہ تھکی تھکی نیند کو بلانے کی بے چین سی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جلی کٹی سنانے کے لئے اُٹھ بیٹھی تھی۔ مگر اُسے ابھی جی کی بھڑاس نکالنے کا پورا وقت بھی نہ ملا تھا کہ کچھ بھانپ کر خان بہادر کھسک گئے اور وہ زیادہ خشمگیں ہو کر دھپ سے پھر پڑ کر لیٹ رہی اور ایک بیزار سے جھٹکے کے ساتھ اُس نے دیوار کی طرف کروٹ بھی پھیر لی۔ جیسے وہ مولوی امجد علی کی نفرت انگیز صورت کو دفع ہوتے ہوئے بھی دیکھنے کی روادار نہیں۔ اُسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ خشمگینی کا بار، جوانی کا بوجھ اور حسرت و نفرت کا وزن اٹھائے چھٹپٹاتی اور تلملاتی رہی۔ نہ جانے کب راشدہ پر اتنی تھکاوٹ طاری ہوئی کہ وہ سو گئی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ سامنے فٹ بال گراؤنڈ میں مزدوروں کا بہت بڑا مجمع ہے۔ اور وہ خود دریچہ کے سامنے کھڑی ہے سب مزدور اُسے گھور گھور کے دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ انبساط و خفگی کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یک بہ یک مزدور مکان کے اندر گھس آئے اور مولوی امجد علی کو پکڑ لے گئے اور انہیں پیٹتے پیٹتے ادھ موا کر دیا اور پھر اُسے لے گئے۔ اور درمیان

میں اونچی جگہ پر بٹھا کے اُس کے سامنے ناچنے لگے۔ اور رقص کرتے کرتے سجدہ ریز ہو گئے ——— وہ صبح کو بیدار ہوئی تو اپنے کو حد سے زیادہ مضمحل اور چور چور محسوس کر رہی تھی۔

راشدہ کی زندگی بیزار، اداس خشمگیں اور مضمحل انداز میں گذر رہی تھی۔ ترسی ہوئی پیاسی جوانی اندر ہی اندر استری کے لوہے کی طرح سلگ رہی تھی۔ موانست کی خواہش کا دم گھٹ رہا تھا جنسِ مخالف سے چُہل اور چھیڑ کی تمنّائیں کراہ رہی تھیں اور جنون خیز محبّت کے حسین شعلوں میں نہانے کی آرزو میں اُس کی منجمد و بے کیف زیست سسکیاں بھر رہی تھی۔

نرگس اُس کے میکے کی ایک نوخیز خادمہ تھی۔ گورا رنگ اور کھلتی ہوئی صورت۔ وہ ہنس مکھ، شوخ، چنچل اور بے پرواسی تھی۔ اُس کا شباب شکنجے سے آزاد تھا۔ جو لیبوں میں پلی ہوئی جوانی شریف زادوں کے لئے تختۂ مشق کا کام دیتی ہے۔ نرگس خانہ زاد لونڈی کی نتنی۔ خانہ زاد لونڈی کی بیٹی۔ اور خود بھی اسی طرح کی ایک لونڈی تھی۔ اُس کے بشرے سے شرفا کے خون کی آمیزش کا پتہ چلتا تھا۔ جو اُس کے مادری خاندان کے سلسلے میں شاید مسلسل ہوتی رہی تھی۔ لیکن وہ شریف نہیں تھی محض ایک لونڈی تھی۔ جسے لوگ حرافہ، قطامہ اور مالزادی کہہ کر پکارتے تھے۔

راشدہ اپنی مسہری پر بیٹھی ہوئی تھکی تھکی انگڑائیاں اور نڈھال جمائیاں لے رہی تھی۔ کہ نرگس جھاڑو سنبھالے فرش آراستہ کرنے کمرے میں آئی۔ سورج دیر کا نکل چکا تھا۔ کھلے ہوئے دریچہ سے دھوپ آ کر کمرے میں بکھر گئی تھی۔ راشدہ کا اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بے مقصد زندگی کا اہل ہو

جاتی ہے۔ نرگس راشدہ سے شوخ تو تھی مگر ایسی بے تکلف نہیں۔ وہ راشدہ سے ڈرتی بھی تھی۔ کیونکہ اُس کے ہاتھوں اکثر پٹ چکی تھی۔ راشدہ کی نظر نرگس کے ہنستے ہوئے چہرے پر پڑی اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ اُس سے پست تر ہے۔ کوئی ادنیٰ تر مخلوق۔ نرگس آزاد اور خوش تھی۔ اور وہ مجبور و غمگین۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ نرگس مالکہ ہے اور وہ خادمہ۔ اُسے اپنے حال پر بےساختہ رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اُس کے دل پر رقت طاری ہوئی اور اُس نے نرگس کو پاس بلایا ——

"نرگس!"

"جی!"

"سارے کام ختم ہو گئے؟"

"جی ہاں!"

"تو آج بڑی خوش ہے؟ کپڑے بھی صاف پہن رکھے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل بھی ہے۔ کیوں ری؟" راشدہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

نرگس شرما سی گئی۔

"اور یہ کپڑے ملے دلے کیسے ہیں رے؟ اور سر کے سنوارے ہوئے بال بھی کھل کھل گئے ہیں؟" راشدہ نے بامعنی سوال کیا۔ وہ اِس وقت نرگس سے بے تکلف ہونا چاہتی تھی۔

نرگس شہ پا کر ہنسنے لگی۔

"رات اچھے صاف کپڑے پہن کر سو گئی تھی؟ چیزیں برباد کرنی خوب آتی ہیں۔ بے ہودی!" راشدہ کو ذرا سا رشک آمیز غصہ آ گیا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ اُس نے چھیڑ چھیڑ کر نرگس سے رات

کی ساری گذری ہوئی باتیں پوچھ ڈالیں۔ نرگس کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی۔ اُسے بے تکلفی بڑی اچھی لگی۔ وہ غرور و مسرت سے پھول گئی ——— اور سارے واقعات کھل کر کہہ دیئے۔

"بدمعاش!" راشدہ نے جذبات سے متاثر ہو کر کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور اُس کی سانس تیز و گرم چلنے لگی۔ اُس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور رُک رُک کر نرگس سے پُر آرزو انداز میں پوچھا۔

"تیرے احمد بابو بڑے اچھے ہیں؟ بد ذات! چھنال! بڑی بلے ہو وی ہے تو۔ . . چھی! ایسا بھی کوئی کرتا ہے . . . . دائی ماما کی ذات جو ٹھہری . . . . "

یہ اپنی کمزوری کا بھرم رکھنے کی پُر تصنّع ڈانٹ تھی

"اوں! ہم کا کرتے۔ احمد بابو بڑے کھراب سے ہیں بس بات اچھی ہے بابو۔ یہی ایک بات بڑی کھراب ہے۔ سچ بولو۔"

نرگس کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ راشدہ اِس خواہش سے تلملا اُٹھی کہ کاش وہ اِسی طرح ہنس سکتی۔

مولوی امجد علی صاحب دوروں پر جاتے رہے اور راشدہ آپ ہی آپ کڑھتی رہی۔ وہ ہوتے بھی تو کیا تھا۔ جاڑے کی چاندنی، خضاب آلودہ داڑھی سے بوجھل تبسّم۔ پُر شکن حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں کی ہوسناکیاں۔ ملتجی بڑھاپے کی اُمنڈے ہوئے شباب سے بھیک۔ مضحکہ خیز حرکتیں اور نفرت انگیز شکست۔ راشدہ دِن دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اس کے صرف دو مشغلے تھے۔ دریچہ سے گلی اور دور کی سڑک کو تکتے رہنا اور نرگس سے اُس کی جوانی کی کامیابی کی

داستان سنتا۔ وہ نرگس سے ایسی باتوں کے متعلق سوال کرتی جس کا نرگس کو گمان تک نہ ہوتا۔
احمد میاں کے تذکرے اکثر رہتے تھے اور دوسرے شریف زادوں کے بھی۔ یہ احمد مولوی امجد علی کا بھانجا تھا۔ اور اُن ہی کے یہاں رہ کر کالج میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے نوجوان ٹینس اور سینما کا بے طرح شوق اور لباس کا خبط۔ ادب و علم سے ذوق نہ تھا۔ مگر فلمی گانے ازبر تھے۔ اگر اُس کی زبان پر کوئی نیا گانا از قسم "پنگھٹ پہ ایک چھبیلی، پانی بھرن کو آئی" سنا جاتا تو سمجھ لیجئے کہ شہر میں کوئی نیا فلم آگیا ہے۔ سہگل کی طرح کرتا پہننا اور آدوسٹن کی شان سے ریکیٹ بغل میں دابنا اُس کی معراجِ تخیل تھی اور انتہائی حسن کردار۔ احمد مولوی امجد علی سے ڈرتا تھا۔ راشدہ کا بہت ادب لحاظ کرتا اور نرگس پر فلمی تعلیمات کی عملی مشق کرتا تھا کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ ممانی جان اُس پر بہت مہربان ہیں۔ اُسکے کھانے پینے کا خیال، آرام کا لحاظ۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اور کیا۔ رفتہ رفتہ ممانی جان اُس سے خاصی دلچسپی لینے لگیں اُس سے کالج کے دلچسپ قصے سنتیں، میچ اور سینما کے متعلق باتیں کرتیں، احمد خوش ہوا کہ چلو ماموں جان کی خشکی اور سختی کا ممانی جان نے کفارہ ادا کر دیا۔

راشدہ نے احمد کی تواضع کچھ یونہی انجان طور پر شروع کی تھی۔ سر رہا ہے نوکرانیوں کو اُس کے کھانے کے متعلق تاکید کر دینی۔ نوکروں سے اس کی چیزوں کے بارے میں پوچھ لینا وغیرہ وغیرہ آہستہ آہستہ احمد کی خاطر داریوں میں اُسے لطف آنے لگا۔ اُس کا یہ بھی جی چاہتا کہ احمد سے باتیں کرے۔ اُس کی کوئی نہ کوئی تقریب نکل ہی آتی۔ جانے کیسے۔ پھر یہ ہوا کہ موقعہ پیدا کیا جاتا اور کچھ دنوں کے بعد یہ معمول سا ہو گیا۔ کہ احمد اپنی باتوں سے ممانی جان کا دل بہلا

رہا ہے۔

راشدہ کو اپنی ویران زندگی میں تھوڑی سی آبادی نظر آنے لگی تھی مگر اس آبادی پر وہ حکمران نہ تھی۔ اس کے دن اب بھی ایک مضطرب بے شغلی اور راتیں ناکام بیتابی میں کٹتی تھیں۔ وہ طویل دوپہر اور پہاڑ سے دن کمرے کے دریچے سے لگی کاٹ دیتی۔ وہ پہلو کے بوسیدہ مکانوں کے رہنے والوں کو جان پہچان گئی تھی۔ پرانا سفید کمانیوں کا چشمہ لگائے ہوئے خمیدہ کمر بڑھیا گوالن۔ جو اپنی کوٹھری میں اکیلی جان سے رہتی اور دودھ سے بالائی نکال کر بیچتی تھی۔ اسکی بغل میں ایک چھوٹا سا غریب خاندان جس میں بہت باتیں کرنے والی عورتیں اور ایک لڑکا کامروتھا۔ گلی میں بیٹھ کر پڑوس کی عورتیں ایک دوسرے کی جوئیں دیکھتی تھی۔ اور مولوی امجد علی کے احاطہ کی چار دیواری پر میلے میلے کپڑے اور بوسیدہ شکستہ گینڈ رے سوکھنے کو دیتی تھیں۔ راشدہ ان گینڈروں کے مختلف رنگ کے پیوندوں اور چیلڑ کی طرح میل سے اٹے ہوئے بخیوں سے مانوس و شناسا ہو گئی تھی۔ مزدوروں کی کوٹھری کے عین پہلو میں ایک بہت ہی تنگ سا سائبان تھا جسے گھیر گھار کر رہنے کی کوٹھری کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس میں ایک سیاہ رنگت بڑھیا میلے سے گینڈرے پر اوندھی جھکی ہوئی یا نالی کے کنارے بیٹھی ہوئی پائی جاتی تھی۔ اس کا سارا بدن بے حد پھولا ہوا تھا۔ اُس کے سُتے ہوئے چہرے سے بڑھاپے کی شکنیں بھی دور ہو گئی تھیں۔ اُس کا بھیانک چہرہ لڑکوں کو ڈرانے کا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ کھونٹے سے بندھی ہوئی ایک نوکیلی داڑھی والی بکری رہتی تھی۔ یہ میلی آنکھوں والی بکری سیاہ رو بڑھیا کی شریک زندگی تھی اور سرمایہ حیات۔ گلی کے دوسرے سرے پر ایک کھنڈر سے مکان میں تین خاندان

رہتے تھے۔ اِن سب سے بھی راشدہ واقف ہوگئی تھی ۔ ایک درمیانی عمر کی مہترانی اپنی نوخیز بیٹی اور گانے اور بڑے بڑے بالوں کا شوق رکھنے والے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی ۔ ایک میونسپلٹی کی موٹر کا چندلا ڈرائیور اپنی بہت سے بچھل والی رنگین ساریوں کی شوقین بیوی کیساتھ رہتا تھا ۔ اور ایک بیمار دمہ کی ستائی ہوئی گوری چٹی بڑھیا اور اُس کی بے حد جوان بہو۔ بڑھیا عریاں و فحش گالیاں بکنے میں وہ وہ جدت و ندرت پیدا کرتی تھی۔ کہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا تھا۔

راشدہ طرح طرح کے پھیری والوں اور اُن کی منفرد صداؤں سے بھی آگاہ ہو گئی تھی ـــــ ایک سلّیا پیسے میں۔ تین سلیا پنچھے میں“ اور ـــــ ” ہند و لیس .. چنیا باد ... کھوئے کا لڈ ... “ ٹوٹے ہوئے آخری لفظ پر ختم ہونے والی تبسّم آفریں مدہم ہوتی ہوئی آواز غرض وہ دریچہ کے سامنے والی گلی کے جزئیات اور اُس کے سارے متعلقات سے پورے طور سے واقف ہوگئی تھی ۔ اور وہ ساری چیزیں اُس کی زندگی کا حصّہ بنکر رہ گئی تھیں۔ راشدہ کو اب سامنے کی کوٹھری کے مزدوروں کا شور بھی گوارا تھا ۔ اُن کے دم سے ویران شاموں اور اداس راتوں کی رونق تھی ۔ اُسے کوٹھری والے مزدوروں سے ہمدردی تو نہیں دلچسپی سی ہو گئی۔ نرگس کے ذریعہ وہ اُن کے حالات دریافت کرتی ۔ روزی کی تلاش میں دور دور سے آئے ہوئے مزدور سال سال بھر گھر نہیں جاتے تھے ۔ وہ جا بھی کیسے سکتے تھے ۔ اوسطاً تین آنے روزینہ کمانے والے لوگ ایک آنہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے ۔ اور مشکلوں سے مہینہ بھر میں چار روپے گھر کو بھوکے پیٹوں کے بھرنے کے لئے روانہ کرتے تھے۔” بیچارے مزدور !“ کبھی کبھار راشدہ کو انکی

حالت پر تھوڑا سا رحم آجاتا۔

اوائل گرمیوں کے دن تھے۔ اپریل کا مہینہ۔ صبح کو گلابی خنکی ہوتی تھی اور گرم دوپہریں نہایت ارمان انگیز تھیں۔ راتیں آغوش میں بھینچی ہوئی نوجوان دلہنوں کی طرح مدہوش۔ کوئل اور فاختہ کی آوازیں دلوں کو برماتی تھیں اور ہوا کے جھونکے جذبات میں تموّج پیدا کرتے تھے۔ غنودہ آرزوئیں انگڑائی لیتی تھیں۔ اور جسم کا جوڑ جوڑ کسمساتا تھا۔

ایک خاموش دوپہر کو راشدہ اپنے دریچہ سے لگی بیٹھی تھی۔ نرگس بھی اس کے پاس کھڑی تھی۔ سامنے کی گلی غیر آبادسی تھی۔ مزدوروں کی کوٹھری کا پھاٹک تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اور دونوں پٹ پر کپڑے ڈال دئے گئے تھے۔ اندر سے ایک آدمی نکلا اور گلی سے گذرتا ہوا سڑک کے کونہ پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ وہاں وہ کچھ دیر کھڑا اور پھر کوٹھری کے اندر واپس آگیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت گلی میں آئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر مزدوروں کی کوٹھری کے اندر داخل ہوگئی۔ ”بولو!“ نرگس نے کہا۔

”چپ! ٹھہر تو!“ راشدہ اس کوٹھری کی طرف متجسسانہ دیکھتی رہی۔ تین چار جوان مزدور اور جانے کدھر سے آگئے اور سب کے سب اطمینان کے ساتھ کوٹھری کے اندر چلے گئے۔ کوئی بیس منٹ کے بعد ایک مزدور نے کوٹھری سے باہر نکل کر گلی کا جائزہ لیا اور اطمینان کر کے اندر واپس گیا۔ فوراً ہی وہ ادھیڑ عمر کی عورت چھپ سے نکلی اور گلی سے تیزی کے ساتھ گذر کر سڑک کے موڑ میں غائب ہوگئی۔ اس کے آنچل سے بندھے ہوئے پیسے پیچھے جھول رہے تھے۔

”ای نو! او ہے بولو۔ چورہے کے کونے پر تلکٹ اور ریوڑی بکتی ہے۔ بیوہ ہے چار پانچ

لڑکا پھڑکا بھی ہے اُس کے" نرگس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"چھی! بڈھی ہوگئی اور ایسا کام کرتی ہے . . . . ."

راشدہ کو مولوی امجد علی کا خیال آیا اور وہ کڑھ کر رہ گئی۔ اُس ادھیڑ عمر کی عورت کے بالوں کو ابھی خضاب کی ضرورت بھی نہ تھی اور جو ہوتی بھی تو وہ خضاب کہاں سے لاتی۔ راشدہ نے اپنی طبیعت کی عجیب ناقابلِ برداشت کیفیت سے نجات پانے کے لئے نرگس سے مذاق کیا:-

"تو کیوں نہیں چلی جاتی ہے اُن مزدوروں کے پاس؟"

"اونہہ . . . . ! ان کمینوں کے پاس؟"

شام تک راشدہ برافروختہ، مضمحل، چڑچڑی اور نڈھال سی رہی ——— شام کو احمد بھی کالج سے نہیں آیا۔ ادھر ہی سے کھیل میں چلا گیا۔ قریباً آٹھ بجے شب کو وہ گھر لوٹا تو راشدہ نے اُسے اپنے کمرے میں بلا کر بہت سی باتیں کیں۔ وہ اضمحلال اور افسردگی کا بار اٹھا کر تھک چکی تھی۔ لہٰذا احمد کی صحبت میں معمولی معمولی باتوں سے مسرت کی تقریب پیدا کر رہی تھی۔ احمد کو حیرت ہوئی کہ آج ممانی جان اتنی بشاش کیوں ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج اُسے اسکنڈ شو، سینما جانا تھا۔

راشدہ اپنے کمرے میں تنہا رہ گئی۔ وہ بیقراری سی نظر آ رہی تھی کبھی بیٹھتی، کبھی اٹھتی، کبھی یونہی ٹہلنے لگتی۔ وہ دریچہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سامنے کے میدان میں نشہ پرور چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ نیلے آسمان کی سیم آمیز گھلاوٹ جذبات کو لے اڑتی تھی۔ موسم میں سکر سارا چھا ہوا تھا۔ ایسٹر کے

کے اُس کونے پر پڑا کٹر والے مکان کے دریچہ سے بجلی کی روشنی میں ایک مرد اور ایک عورت کے جسم کا بالائی حصّہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ مزدور کوٹھری سے باہر نکل کر گلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھا خوب جمی ہوئی تھی۔ سب مل کر زور زور سے گیت گا رہے تھے ——

"جھولنی پہنا کے سیاں چھوڑے چھپتیا —— سیاں چھوڑے چھپتیا!" خوب تھا تھیا مچی ہوئی تھی۔ ایک گیت ختم ہوتا نہیں کہ دوسرے نغمہ کا بول فضا میں لہرانے لگتا۔

"چھوٹے نہ دیب جوبنا پٹ گاڑی دیب ہو . . . ."

راشدہ اِن گیتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے اُسے لطف آ رہا تھا۔ وہ بیتاب سی ہو گئی۔ خون کا ایک فوارہ اُس کے دل سے چھوٹ کر سارے جسم میں تیر گیا۔ اُس کے لب خشک ہو رہے تھے۔ اور اُس کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی سانس چلنے لگی۔ اس پر ایک عجیب ہیجان اور انتشار طاری تھا۔ تکلیف اور لذت سے ملا ہوا۔ وہ دریچے سے ہٹ آئی اور ذرا رُک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ یک بہ یک اُس نے محسوس کیا کہ دل منہ کو آیا جاتا ہے دھک سے جیسے اُس کا دل رُک سا گیا اور پھر تیزی سے دھک دھک دھک چلنے لگا۔ گھر کے نوکر اپنے اپنے کمروں میں تھے اور دائیاں ماما ئیں صحن میں لیٹی ہوئی تھیں یا باورچی خانہ میں برتن باسن دھو رہی تھیں۔ مولوی امجد علی دورے پر گئے ہوئے تھے۔ وہ سیدھی احمد کے کمرے کی طرف گئی اور جھانک کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ کپڑے بدل رہا تھا۔ صرف ٹائی باندھنی باقی تھی۔ راشدہ کو دیکھ کر وہ چونکنا ہو گیا۔

"کون؟ ممانی جان!"

پھر وہ ٹائی باندھنے اور سینما کے متعلق باتیں کرنے لگا۔

"آج سینما مت جاؤ!" راشدہ نے نہایت ملتجیانہ انداز میں کہا

"بہت اچھی فلم ہے ممانی جان۔ زمانہ کے بعد دیوداس صرف ایک شو کے لئے آیا ہے"۔

"میری طبیعت جو گھبرا رہی ہے۔ مت جاؤ"۔ راشدہ نے ناز کرتے ہوئے کہا اور آگے جھکر وہ احمد کا شانہ پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ کوٹ پہن کر آئینہ میں اپنا آخری جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں اُسے اپنے سے بہت قریب راشدہ شانہ پکڑے ہوئے نظر آئی۔ اُس نے اس کے ہاتھ کی لمس بھی محسوس کی اور حیرت زدہ ہو کر پیچھے مڑا۔ آج پہلی دفعہ اچانک اُس کی نظروں سے جیسے پردہ اُٹھ گیا ہو۔ راشدہ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے تمنائیں عریاں طور پر جھانک رہی تھیں۔ احمد کے لئے یہ نیا انکشاف تھا۔ بہت سی باتوں کا مفہوم اُسے اب سمجھ میں آنے لگا۔ وہ مبہوت کھڑا تھا۔ راشدہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اُسے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ آہستہ سے چھڑا کر وہ فوراً حیران پریشان کمرے سے یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

"ممانی جان بہت دیر ہو رہی ہے"۔

راشدہ بھی اس کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور "میں بھی چلونگی" کہتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے صدر دروازہ تک گئی۔ احمد تیزی سے نکلا اور چلا گیا۔ راشدہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ گھر کے لوگ دوڑے آئے۔ کوئی اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ کوئی دوڑا ہوا محلہ کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر آیا تو وہ ہوش میں آکر دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔

"ہسٹیریا" اُس نے کہا۔ ماما ئیں اور نوکرانیاں آسیب کا سایہ سمجھ رہی تھیں۔ اور کوٹھری کے مزدور رات تک گا رہے تھے۔

"میری پھلتی پھولتی جوبن کی ڈال
اِسے کیسے میں رکھوں سنبھال کے..."

پس منظر

"بہن زمانہ بُرا ہے۔ ایسا بھی کیا۔ دھا گڑ سی جوان جہان کنواری لڑکیوں کو بندریا کی طرح دوربہ دَر لئے پھرنا۔ بڑی بھابی تو زمانہ بھر سے نرالی ہوگئی ہیں۔ آخر میں نے بھی تو تین لڑکیوں کو پوس پال کر بیاہا۔ اوراب یہ ماشاء اللہ چوتھی نشاکرہ ہے بھلا کوئی انگلی تو اٹھالے۔"

——— اور اس کے جواب میں "کیا مجال!" اور صدائے بازگشت کے طور پر ———

"سچ کہتی ہو بہن، کنواری لڑکیوں کو داب کر رکھنا چاہیئے۔ واقعی بڑی بھاوج شرافت پر بٹہ لگاتی ہیں۔ تنویر و پروین کو تو دیکھو۔ یہ فرنگیوں کے انداز۔ اٹھان پہ کی لڑکیاں اور ایسی سرچڑھی۔ بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں ٹپ ٹپ دخل کمیسا دیتی ہیں۔"

یہ تھی وہ گفتگو جو نشاکرہ نے اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے سنی۔ اسکی ماں اور رشتے کی خالہ آپس میں

باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ کو غصہ آ گیا۔ اُسے خالہ صاحبہ سے نفرت تھی۔ ایک تو اُس کی الدہ سخت پابندیوں کی قائل اور اس پر کریلے اور نیم چڑھے والی بات۔

"خالہ بنی ہیں! اونہہ خالہ! ہے کیسی موٹی گول مٹول۔ ہر وقت کچر کچر پان چباتی رہتی ہے۔ بوڑھی بکری!" شاکرہ نے ناخن کریدتے ہوئے زیرِ لب کہا۔ اسکی تیوری پر بل آ گئے۔ شاکرہ پندرہ سال کی تھی مگر اسکی پرورش ایسے خاندان میں ہو رہی تھی جہاں کنواری لڑکیاں اس طرح رکھی جاتی ہیں جیسے جیل کے خطرناک قیدی یا پاگل خانہ کے تشدد پسند مریض۔ اسکی صحت یوں تو اچھی خاصی تھی مگر وہ کچھ گھٹی گھٹی اور چڑچڑی سی معلوم ہوتی تھی۔ خالہ بی کی باتیں سنکر وہ جل ہی تو گئی۔ پھر کچھ واضح اور غیر واضح خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ وہ تنویر و پروین کو بے حد پسند کرتی تھی۔ انکی خوبصورت ساریاں اُن ساریوں کی حسین بندش نظر فریب آرائشِ گیسو گہرا گلابی سینٹ اور لبوں کا گلگونہ ایک بہ یک تنویر و پروین کے گلنار لب شاکرہ کے تصور میں چہک اُٹھے "کاش میں بھی اس طرح سج سکتی! پھر اُن دو بہنوں، دو حسین بہنوں کی پیاری پیاری باتیں، ادب، افسانے، نظمیں، آہ اُن نظموں میں کیا جادو ہوتا ہے! وہ بھلی سی نظم۔ اچھا وہ ——— کاش تم چلے آتے مستئ صبا بنکر! اور میرے ہاں۔ کل کا گھوڑا سمندری شہزادی جیسے میں ابھی تک ننھی ہی دھری ہوں ہوں! اور دیکھ لو۔ کیا کتاب ہوئی! راہِ نجات۔ سوچ کا ثواب جنت کا حصول۔ بہشتی زیور۔ برائی کا انجام صبغۃ اللہ ... وہ تو خدا بھلا کرے ناصر کا۔ بھائی جان کی میز پر سے اچھے اچھے رسالے چرا کر لا دیتا ہے۔ بیچارہ ناصر۔ اور جو ناصر نہ ہوتا! اونہہ ...."

شاکرہ انہیں خیالات میں گم تھی کہ پھر گفتگو کی ایک سمع خراش موج باہر سے آئی۔

"یہ تنویر و پروین تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ مجھے انکے لچھن اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ بھلا

کنواری لڑکیاں یوں ٹھٹھا کے لگاتی ہیں"۔ یہ خالہ بی کی تنقید تھی۔ شاکرہ کا جی چاہا کہ وہ انہیں چیخ اکر خوب زور سے قہقہے لگائے مگر یہ ناممکن تھا۔ اس کا ارادۂ بغاوت بجھ کر رہ گیا۔ اُسے تو مسکرانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ ہر وقت سنجیدہ کیا ماتمی چہرہ بنائے بیٹھے رہنے کا حکم تھا۔ اسے ہنسو مت، بولو مت۔ چوہوں کی طرح دبے پاؤں چلو، مجرموں، خطاکاروں کی طرح سمٹے سمٹائے رہو۔ غرض سینکڑوں احکام تھے۔ جنکے مسلسل بوجھ تلے اس کی ساری امنگ پس کر رہ گئی تھی۔ شاکرہ کے چہرہ پر نفرت، پسپائی اور ایک بیزار سی چڑچڑاہٹ کے نقوش بنے اور پھر نوع در نوع جذبات کی موجوں کے ہلکوروں سے مٹ گئے۔

یہ خالہ بی شاکرہ کی والدہ کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ اور انکی مہربانی کو سراہتی تھیں۔ اسکے صلے میں دعوتیں، سوغاتیں اور ہر طرح کی خاطرداریاں۔ ان کے میاں نے ایک رنڈی رکھ لی تھی اور یہ انتقاماً اکثر گھر سے غائب رہا کرتی تھیں۔ ایسے ہی قدردان عزیزوں کے یہاں۔ مگر اُن کے برتاؤ میں ایک خاص ٹھسا اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یہ ہاں میں ہاں ملاتیں بھی تو اِس انداز سے جیسے بزرگانہ پسندیدگی کا اظہار فرما رہی ہوں۔ شاکرہ کی والدہ پر انہوں نے اپنی اہمیت اور ضرورت ثابت کر دی تھی۔ اور یوں بھی گھر گرہستی اور سماجی اصولوں میں دونوں کا اتفاق تھا۔ شاکرہ کی والدہ "خالہ بی" کی پسند اور ناپسند کا بڑا پاس کرتی تھیں۔ جیسے ایک فن کار دوسرے ہم نظر، ہم ذوق فن کار کی تعریف کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ اسی طرح انہیں "خالہ بی" کا سراہنا بہت مرغوب تھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ کنواری لڑکیوں کی تربیت کا معیار قائم کرنے میں بھی "خالہ بی" کا بڑا دخل تھا۔ خالہ بی تو سرزنش تک کی قائل تھیں اور اس بلند معیار پر شاکرہ کی والدہ کا پورا اترنا ضروری تھا۔ لہٰذا جب بھی یہ "خالہ بی" گھر میں

رونق افروز ہوتیں۔ شاکرہ اپنے کندھوں پر تربیت کا وزن زیادہ محسوس کرتی شاکرہ جب نو سال کی ہوئی اُسی وقت سے وہ باضابطہ طور پر محض لڑکی سے کنواری لڑکی شمار کی جانے لگی اور مکلف بنا دی گئی۔ اوامر و نواہی کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ احکام سے ممانعتوں کی فہرست زیادہ طویل ہوتی گئی۔ کنواری لڑکیاں یوں نہیں کرتیں۔ وہ نہیں کرتیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ احکام زیادہ مستحکم اور ممانعتیں زیادہ شدید ہو گئیں۔ یہاں تک کہ پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک کوٹھری میں مقید ہو کر رہ گئی۔

شاکرہ سینا پرونا، کھانا پکانا، اور خانہ داری کے دوسرے کام سب سیکھ چکی تھی گھر میں باورچن، خادمائیں، مامائیں موجود تھیں۔ لہٰذا اُسے کچھ خاص کام بھی کرنا نہ ہوتا بس یونہی سینے پرونے رہنا کبھی کبھار باورچیخانہ میں کوئی اچھی چیز پکانے چلے جانا اور پھر اپنی کوٹھری میں پڑے بہشتی زیور پڑھنا۔

"اتنی بڑی ہو گئی اور اوڑھنی گلے میں لپیٹے پھرتی ہے۔ اِدھر آ! اسے یوں اوڑھتے ہیں کمبخت اتنا بھی سلیقہ نہیں تجھے۔"

یہ تھے تادیبی الفاظ جو شاکرہ نے آٹھ سال کی عمر میں سنے۔ اُس نے سوچا تھا کہ یہ اوڑھنی اوڑھنے میں مجھ پر نئی پابندیاں کیوں لگائی جا رہی ہے حکم کو تو وہ بھول گئی۔ لیکن حکم کی تلخی کا ایک مبہم احساس اس کے دل سے ہٹ نہ سکا۔ اُس نے کئی بار گھرکیاں سنیں مگر وہ اوڑھنی کے الجھاو میں گرفتار ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ ماں اور بڑی آپا کے سامنے تو خیر مگر بہنوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے وقت وہ کچھ انتقاماً بھی اوڑھنی کو اتار پھینکتی۔ بارہ سال کی عمر میں اُسے خود اوڑھنی سلیقے سے اوڑھنے کی ضرورت نمایاں نظر آنے لگی لیکن حکم کی غیر ہمدردانہ شدت کی خلش اُسے اکثر عدولِ حکم پر مجبور کرتی اور وہ اوڑھنی گلے میں نام کیلئے لپیٹ کر کبھی گھر کی انگنائی یا کوٹھے کی چھت

پر یونہی یا کسی چھوٹے بچے کو پکڑنے کے لئے دوڑ جاتی۔ اُسے کپڑے کی سرسراہٹ اور ہوا کے مس سے لذت حاصل ہوتی اور سب سے بڑھکر نافرمانی کی مسرّت۔

"اری کمبخت! بے حیا! اُچھلّے لگاتی پھرتی ہے۔ بے شرم! جوان ہو گئی اور لاج شرم کچھ نہیں جب دیکھو اُڑی ہوئی ہے یہاں آ!" "شاکرہ! کُدکّے مت لگاتی پھر!" اسی قسم کی آوازوں سے شاکرہ کی پھوٹتی کونپل کو "خوش آمدید" کہی جاتی تھی۔ وہ سوچتی کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے جو یکایک اماں جان اور ابا جان مجھ سے ناحق کے ختفا رہنے لگے ہیں جب سنو "جوان ہو گئی ہے" یہی سنتے سنتے تو کان پک گئے۔ جیسے ان باتوں میں میرا قصور ہے۔ شاکرہ اٹھتی ہوئی نظروں سے اپنی پیش نگاہ تبدیلیوں کو دیکھتی اور ایک مسرّت انگیز حیرت کے احساس میں بزرگوں کی سختیوں کو بھول سی جاتی۔

"کنواری لڑکیوں کو دبا کے رکھنا چاہیئے۔ جوانی دیوانی . . . ." ایک روز شاکرہ نے خالہ بی کی یہ بولی سنی۔ اُس روز اُسے ایک نہایت ہی عجیب اور وحشتناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ ابتک اُس تجربہ کی گھبراہٹوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈری ڈری سہمی ہوئی، پریشان، متفکر، بدحال ـــــ" خالہ بی کی بکواس سے وہ سر سے پاؤں تک سلگ سی اُٹھی۔ وہ سوچنے لگی" لوگوں کو مجھ سے نفرت ہو گئی ہے تو میں بھی سب سے نفرت کروں گی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے اور یہ لوگ بے حس بنی ہوئی اُلٹا میرے خلاف مشورے کر رہی ہیں۔ میں جوان جو ہوئی تو جیسے بڑا گناہ کیا۔ جس کی سزا مجھے دی جاتی ہے۔ اے اللہ میں مر ہی کیوں نہیں جاتی۔ اچھا ہے اب اسی طرح جان نکل جائے گی۔"

شاکرہ کبھی سوچتی کہ آخر یہ جوان ہونا کیا بات ہے۔ وہ مبہم مگر حقیقی نئی کیفیتوں کی تہ میں

ڈوب کر اپنے آپ سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اُس کے ذہن و تخیل نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں بدل رہے تھے رفتہ رفتہ اس کے احساسات غیر واضح انداز میں انگڑائیاں لینے لگے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک موہوم مگر شیریں سرگوشی کا سُراغ پانے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا افق وسیع اور رنگین ہوتا محسوس ہو رہا تھا مگر اس وسعت میں ایک کپکپا دینے والا حیرت افزا خوف بھی تھا اور اس رنگینی کے ساتھ بے دردی اور اوامر و نواہی کے سیاہ بادل بھی منڈلاتے نظر آتے تھے۔ وہ اب تک چھوٹے بچے بچیوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھی مگر اب وہ نوجوان لڑکیوں کی صحبت کو پسند کرنے لگی شاید وہ ان کے مطالعہ سے اپنا راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دو بہنیں ہنوز کنواری تھیں۔ ایک اکیس سال کی اور دوسری انیس کی۔ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور آپس میں گاہے گاہے رازدارانہ طور پر باتیں کرتی پائی جاتیں۔ شاکرہ کو بھی ایک جستجو سی رہنے لگی کہ وہ کیا باتیں کرتی ہیں اور ایسی باتیں جو اماں جان اور بڑی آپا کے سامنے آتے ہی رک جاتی ہیں۔ مگر وہ اُن کی صحبت میں نہیں پاتی تھی۔ "شاکرہ تو بڈھی کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ آ کر کیا بیٹھتی ہے؟" غریب شاکرہ عجیب دوراہے پر تھی۔ وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کد کڑے بھی نہیں لگا سکتی تھی اور نوجوان لڑکیاں اُسے پوچھتی نہیں تھیں۔ محلے کی کنواریاں بھی اسکی بہنوں ہی کے ساتھ جا کر بیٹھتیں اُٹھتیں یہاں تک کہ اُس کی ہم عمر لڑکیاں بھی اُسی مجلس کو پسند کرتیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اُسی محفل کی دلدادہ تھی۔ ہاں شاکرہ کی ایک دو ہم سن لڑکیاں جب اُس بزم سے نکالی جاتیں تو پھر شاکرہ کے ساتھ باتیں کرنے آ جاتیں مگر یہ سب بھی تو ویسی ہی بھولی بھالی تھیں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بہر کیف شاکرہ کا جذبۂ جستجو تشنہ ہی رہا۔ اُس کے دل میں نئے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے مگر وہ ماحول کی ناہمدردی کے سبب

سوکھ سوکھ کر فنا ہو جاتے تھے۔ اُس کے جی میں صدہا سوالات پیدا ہوتے اور اسکا جواب بس اِس طرح ملتا ـــــ "کنواری لڑکیوں کو یہ نہیں بولنا چاہیئے۔ وہ نہیں کہنا چاہیئے۔ ٹپ ٹپ باتوں میں دخل دینا بُرا ہے۔ بال یوں نہ سنوارو۔ نظریں یوں نہ اٹھاؤ۔ اِس طرح چلنا معیوب ہے۔ اِس طرح ہنسنا بے شرمی ہے۔ ایسے کپڑے نہ پہنو۔ یہ مت کھاؤ۔ وہاں مت بیٹھو۔ ادھر نہیں جاؤ" شاکرہ سوچتی آخر وہ کیا کرے۔ بس اسی طرح سوچتے رہنے سے اس کی زندگی ہی محض سوچ ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے من کی کٹیا کے اندر تنہا عالمِ خیال میں زندگی بسر کر رہی تھی۔

جب شاکرہ چودہ سال کی ہوئی تو ایک ہی ساتھ اُسکی دونوں کنواری بہنوں کی شادیاں رچائی گئیں۔ ان دونوں خالہ بی تو مستقلاً شادی کے گھر ہی آکر رہ گئی تھیں۔ انکے حاضر و ناظر ہوئے بغیر کوئی کاج بھلا کیسے انجام پا سکتا تھا۔ مہمان بی بیاں بھی آئی تھیں۔ لہٰذا شاکرہ پر سخت پردے کے احکام نافذ کر دئے گئے تھے۔ دلہنوں کے مانجا بیٹھنے والے کمرے میں بھی اُسے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اوّل تو رشتہ دار بی بیاں وہاں دلہنوں کو دیکھنے آتی رہتی تھیں اور پھر دلہنوں کی سکھیاں رنگین محفل جمائے بیٹھی چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ برات کے دن قریب آتے گئے اور رنگ رلیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر طرف گھما گھمی اور کام کاج کے ساتھ بے کام کے کام بھی ہوتے رہتے تھے۔ راتوں کو محلے کی نوجوان لڑکیاں آجاتیں تو شاکرہ کا دل خوب بہل جاتا۔ مگر دن کو وہ تنہائی اور قید سے اکتائی اکتائی رہتی۔ گھر میں ہر سو چہل پہل مگر اس کے لئے گھر بیابان۔ ان دنوں شاکرہ پر کچھ راز منکشف ہوئے۔ کنوارپنے اور جوانی کے راز۔ شادی کے گھر میں عمر رسیدہ عورتیں بھی ماضی کی رنگینیاں بیان کر کے کچھ دیر کے لئے سرشار ہو لیتی ہیں۔ اور نئی شادی شدہ لڑکیاں کنواریوں کو چھیڑ چھیڑ کر راہ و رسمِ منزل سے آگاہ

کر جاتی ہیں۔ شاکرہ پر بھی رنگین انکشافات ہوئے مگر غیر واضح طور پر۔ اس کے تخیل کو اور مہمیز لگ گئی۔ وہ دن بھر کوٹھری میں پڑی نئی باتوں کو سوچتی رہتی۔ وہ علم اور لاعلمی کی بھول بھلیاں میں اُلجھی رہتی۔ اس کا جذبہ تجسس اُسے بے قرار رکھتا اور سوچتے سوچتے وہ تھک کر چڑچڑا سی جاتی۔ اس کا اپنا جسم اس کے لئے باعثِ حیرت تھا۔ اور روح کی گہرائیاں اُس سے زیادہ حیرت فزا۔ خون کی روانی اور مبہم تمناؤں کی موجیں کبھی اسے خواب آگیں رنگین جزیروں میں لے جاتیں اور کبھی سرشار حقیقتوں کی طرف مائل کر دیتیں۔ وہ تخیل کے طیارے پر پرواز کرتی، تمناؤں اور حسرتوں کی کشتی پر ڈگمگاتی اور گاہ تصور کے تیتا نہ تہیہ کر کے اپنے نوجوان بیدار ہوتے ہوئے حواس کو انجان تجربوں سے ولولہ خیز لذت کے حصول کا موقعہ دیتی۔ اس کے دل و دماغ اور ذہن و روح ایک علیحدہ دنیا بناتے اور بگاڑتے رہتے تھے۔ رات آتی تو شادی کی فضا سمند ناز پر اک اور تازیانے کا کام کر جاتی۔ شاکرہ رات رات بھر جاگتی رہتی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی اور اُٹھ اُٹھ کر صراحی سے پانی پیتی تھی۔

آخر کار وہ دِن کی نشتر بدست تنہائیوں سے گھبرا اٹھی تھی۔ اُس نے ایک روز ناصر کی منت سماجت کی تاکہ وہ اُسے بھائی جان کی کچھ کتابیں پڑھنے کو لا دے۔ ناصر رشتے کا ایک غریب لڑکا تھا جو ملازم نما طالب العلم کی طرح شاکرہ کے گھر رہتا تھا۔ بیوقوف، خوفزدہ سمٹا سمٹا یا سا بارہ سال کا کم رو لڑکا۔ چھوٹے چھوٹے برابر ترشے ہوئے سر کے بال، اونچی چھری کا ٹخنے، پاجامہ دھاریدار میلی سی قمیص، پرانی سلیپریں جھکی ہوئی گردن اور رہتے ہوئے مسکین سے تیور یہ اس کی خصوصیات تھیں۔ شاکرہ ہمیشہ ناصر سے نفرت کرتی رہی تھی۔ مگر اب ضرورت کے وقت وہ اس کی خوشامد کرنے پر مجبور تھی کیونکہ بھائی جان کی میز پر یا الماری میں سے کتابیں اور پرچے نکال لانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ناصر اُس کی امداد پر

راضی ہو گیا تھا۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے اور شاکرہ اس دور سے ایک نئے جاگے ہوئے احساس کے ساتھ نکلی ادھوری واقفیت، رنگین ابہام اور ابہام کی آرزو انگیزی مگر وہ تکمیل کیلئے کڑھتی ہی رہی اور نوجوان زندگی کے قدم آہستہ مگر یقینی طور پر اپنے جدید ممکنات اور نئے مطالبات کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

بہنوں کی شادی ہو جانے کے بعد اب وہ بھی اپنی نو رسیدہ برتری کی دھونس شاکرہ پر جمانے لگیں۔ وہ شادی شدہ ہو گئی تھیں اور یہ نیا اعزاز و افتخار انہیں اکسا تا رہتا تھا۔ وہ خالہ بی، اماں جان اور ابا جان سے بھی زیادہ اس کے کنوارپنے کی داروغہ بن گئی تھیں۔ شاکرہ کا تخیل آباد تھا مگر اسکی دنیا ویران تھی۔ اُسے تنہائی، بیگانگی، اور کسمپرسی کا تلخ احساس ہوتا رہتا تھا۔ وہ اپنا غصہ گھر کی نوکرانیوں پر اتارتی۔ ذری ذری بات پر بگڑ جاتی، ناک بھوں چڑھاتی اور اکثر برس بھی پڑتی بہلن چوکی سے دُور کیوں ہے؟ گھڑوں میں نہانے کا پانی دیر میں کیوں بھرا گیا، صابن دانی کدھر سٹادی گئی بلبین کیا ہوا۔ بس اتنی سی بات اُس کے مزاج کو برہم کر دینے کے لئے کافی ہوتی اور اُسکے نتیجے میں اُسے اکثر سخت سست سننا پڑتا تھی شادی شدہ بہنیں بول اُٹھتیں "ہے کیسی بد مزاج، بدزبان، دماغ ہر وقت عرش پر رہتا ہے۔ دیکھتیں نہیں اماں جان شاکرہ کی بد دماغیاں؟ کنواری لڑکی اور ایسی بیباک شوخ چشم!" شاکرہ دل میں کہتی "اونہہ کل کو خود بھی تو کنواریاں تھیں۔ اور بد مزاجی میں گھر میں مشہور۔ اور اب تو دماغ ملتے ہی نہیں۔ چلی ہیں مجھ پر دھونس جمانے" گھر کی نوکرانیاں بھی شاکرہ سے منہ پھلائے رہتی تھیں۔ شادی شدہ بہنیں اگر ڈانٹتی تھیں تو پیسے اور کپڑے بھی دیتی تھیں اور شاکرہ محض ایک کنواری لڑکی تھی بس ایک بیچارہ ناصر تھا جو شاکرہ کی نرم و گرم سُن لیتا تھا۔ اور ہر حال میں شاکرہ سے مانوس اور اُس کا طرفدار رہتا

تھا۔ مگر اس کی ہستی ہی کیا۔ ایک ہیچ سا غریب لڑکا۔ بہرحال شاکرہ رفتہ رفتہ ناصر کو اپنا بہی خواہ سمجھنے لگی۔ شاکرہ نے ایک بلّی اور چند خرگوش پال رکھے تھے۔ اُن کی دیکھ بھال بھی ناصر کے سپرد تھی۔ بلّی خرگوش اور ناصر شاکرہ کی جذباتی زندگی میں دن بہ دن زیادہ اہمیت حاصل کرنے لگے۔ خرگوش سب سے زیادہ۔ کیونکہ وہ کھلنڈرے تھے اور چونچال۔ اس کے بعد بلّی کہ وہ اس کے ساتھ ملکر خُر خُر سوتی تھی۔ اور پھر ناصر۔ کبھی کبھی شاکرہ چاہتی کہ ناصر بھی شوخ چنچل ہوتا اور اچھی اچھی باتیں کرتا مگر وہ تو ایک بیوقوف سا مضمحل، کم گو لڑکا تھا۔ کاش اس کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے آثار ہوتے جیسے خرگوش کی سُرخ یا بلّی کی ہوشیار چمکتی ہوئی کرنجی آنکھوں میں تھے۔ خرگوش، بلّی، اور ناصر کے علاوہ بڑی آپا کا دو سالہ بچہ بھی شاکرہ کی توجہ کا ایک نقطہ تھا۔ وہ اِسے گود میں لیکر خوب پیار کرتی۔ اُسکے بوسے لیتی اور اُسے خوب زور سے اپنی آغوش میں بھینچتی۔ اسے اِس عمل سے بڑی تسکین ہوتی۔ بچہ کو آغوش میں چمٹاتے چمٹاتے وہ تیزی سے دوڑ جاتی اور پھر بچے کو ہوا میں اچھالتی۔ کبھی یک بہ یک اسکا جی چاہتا کہ ناصر اُس کی گود سے آکر بچے کو لے لے۔ وہ ذرا شرما جاتی اور پھر بچے کو زور سے سینے سے چمٹا کر بھینچتی اور چٹاخ چٹاخ اُس کے بوسے لینے لگتی۔ اُس نے دو تین بار ناصر کو بلا کر بچے کو اُسے دیا بھی مگر ناصر تو ڈرا ڈرا، سہما سہما آکر حکم کی تعمیل کر جاتا اور بس۔

تو ہاں سائبان میں شاکرہ کی اماں جان اور خالہ بی بیٹھی ہوئی مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ بیٹھی بیٹھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی کوٹھری سے نکل کر یونہی سارے گھر میں گشت کر آئی۔ بڑی آپا سسرال چلی گئی تھیں۔ نئی شادی شدہ بہنوں میں سے ایک اپنے میاں کو خط لکھ رہی تھیں۔ اُنکے

کے کمرے میں جو شاکرہ جا نکلی تو انہوں نے ناز و فخر و شرم کی آمیزش کیساتھ چیں بر جبیں ہو کر اُسے ایک ہلکی سی جھڑکی دی اور جھٹ سے خط کو چھپا لیا۔ دوسری بہن غسل کے نہیہ میں اِدھر اُدھر جڑ چڑ کرتی پھر رہی تھیں۔ شاکرہ اُن سے بچتی ہوئی پھر اپنی کوٹھری میں واپس آ گئی اور آ کر دھب سے پلنگ پر بیزاری کے ساتھ پڑ رہی۔ تھوڑی دیر پڑی رہنے کے بعد وُہ اُٹھی اور آئینہ میں اپنا مُنہ دیر تک دیکھتی رہی اُس نے ہر زاویئے سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُسے اپنے پر کچھ اعتماد ہوا۔ وُہ اچھی خاصی صورت رکھتی ہے۔ اسکی سہیلیاں بھی تو یہی کہتی ہیں۔ اس نے پھر اپنے جوڑے کو کھول کر آئینہ میں دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مسرّت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وُہ اپنے کھلے ہوئے جوڑے کو سنوارنے لگی۔ اُسے اپنی سیدھی مانگ اور لپٹی ہوئی پٹی دیکھ کر غصّہ آ گیا۔ تنویر و پروین کیسی خوبصورت کج مانگ نکالتی ہیں اور وُہ ہلکی پھلکی خم بہ خم ایک طرف کو جھکی ہوتی حسین سی پٹی۔ اُس نے آئینہ میں اپنا چہرہ پھر غور سے دیکھا۔ ایسی بد وضع مانگ اور ایسی فرسودہ انداز کی پٹی نے اُس کی شکل کو کیسا غارت کیا ہے۔ وُہ تو سچ مچ بدصورت ہی دکھتی ہے۔ اندر سے ایک آواز اُٹھی۔ نہیں نہیں تو حسین ہے لیکن اُس پرانے فیشن نے تجھے بدنما کر دیا ہے۔ شاکرہ کا جی چاہا کہ وُہ ساری پابندیوں کی زنجیریں توڑ کر رکھدے پھر ایک اور خواہش اُبھری۔ کوئی آ کر اُسے دیکھتا اور اُسے پُر زور طریقے پر یقین دلاتا "شاکرہ تم بیحد حسین ہو" مگر زنجیریں شکستنی نہ تھیں اور کوئی اُس کے حُسن کی ستائش کرنے والا بھی نہ تھا وُہ نا امیدی اور بے اعتمادی کی چوٹ کھا کر رونے لگی۔ اُس نے آئینہ جھٹک کر ہٹا دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وُہ کچھ دیر اسی طرح سسکیاں بھرتی رہی

"ناصر! ناصر! ادھر آ ناصر، ذرا بازار سے پان لا دے!"

یہ اُس کی ماں کی پکار تھی۔ شاکرہ اُٹھ بیٹھی اور بستر کے نیچے سے ایک پڑا ہوا پرچہ نکالکر یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔ ناصر ادھر سے گذرا۔ شاکرہ نے اشارے سے اُسے اپنی کوٹھری میں بلایا اب ناصر تیرہ سال کا ہو گیا تھا۔ اُس سے ملنے میں تھوڑی سی پابندی لگا دی گئی تھی یعنی دونوں تنہائی میں ایک جگہ نہ پاتے جائیں بس اتنا۔ ورنہ ناصر تو ایک بدھو قسم کا کوتاہ قد سروسالڑ کا تھا ناصر اِدھر اُدھر دیکھتا، ڈرتا ہوا شاکرہ کی کوٹھری میں دبے پاؤں آیا۔ شاکرہ نے کہا "ناصر اوپر میں بھائی جان کی الماری میں سے کوئی اچھی سی کتاب لیتے آنا طبیعت بہت گھبرا رہی ہے"۔

ناصر "اچھا" کہتا ہوا چلا گیا۔ شاکرہ اپنے بال سنوارنے لگی۔

شاکرہ نے پروین و تنویر کی طرح بال سجائے مگر پن کے بغیر وُہ جمتے نہ تھے۔ بڑی کوشش سے کچھ بات بنی۔ وُہ دیر تک طرح طرح سے آئینہ میں اپنی نئی سجاوٹ کو دیکھتی رہی۔ اس کی کوٹھری کی طرف کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ اُس نے ڈر کر جھٹ ٹیڑھی مانگ کو مٹا دیا مگر وہ یونہی سی آواز تھی۔ کوئی آ نہیں رہا تھا۔ اُس نے بالوں کو پھر جدید فیشن سے بنایا اور خود کو آئینہ میں دیکھکر بہت مسرور ہوئی۔ وُہ اُٹھی اور اُٹھ کر اُس نے قلمدان سے قلم نکالا، اُلٹی جانب سے اُسے دوات میں ڈبو کر پیشانی کے وسط میں سیاہ بندی لگائی اور آئینہ کے سامنے جھوم سی گئی۔ اچانک اُسکے دماغ میں ایک خیال آیا۔ وُہ زیر لب مسکرا اُٹھی۔ اُس نے دوسرے قلم کو سُرخ دوات میں ڈبویا اور اُسے اپنے متبسم لبوں پر مل لیا۔ اُس کے لب انار کلی کی طرح لہک اُٹھے۔ اُس کے دل میں مسرت کی موجیں مچلنے لگیں اور اُس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے سرمستی کے پھول برسنے لگے۔ وہ اپنی شبیہ دیکھکر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ کاش یہ آئینہ ایک بولتا ہوا جادو کا آئینہ ہوتا اُسکے حسن کی تعریفیں کرتا

اور شاکرہ ایک وجد کے عالم میں اُسے پیار کر لیتی۔ اپنے سینے سے لگا لیتی اور اُس سے بہت ڈھیر سی اچھی اچھی باتیں کرتی رہتی۔

"شاکرہ باجی! شاکرہ باجی ـــــ! فرحت بھائی اپنے پرچے تلاش کر رہے ہیں۔ جلد لائیے نا ـــــ جلد! پرچے!"

ناصر کی گھبرائی اور گھٹی ہوئی آواز نے شاکرہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ شرما گئی مگر اُسے غیر متوقع خوشی بھی حاصل ہوئی۔ ناصر نے اُس کا جلوہ "تازہ" دیکھا۔ وہ مبہوت ہو جائیگا۔ "اُف شاکرہ باجی اتنی حسین ہیں!" اور شاید شعلہ حسن اُس کے ٹھنڈے منجمد سے دل اور مرجھائی ہوئی آنکھوں میں زندگی، رواں دواں زندگی کے چراغ جلا دے۔

"کتاب لائے ناصر؟" شاکرہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! ـــــ فرحت بھائی، پرچے! باجی پرچے!" ناصر نے بوکھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں دیتی پرچے۔ تم کتاب نہیں لائے"۔ شاکرہ نے پرچے نکالتے ہوئے شرارت سے ناصر کو دیکھا اور بیساختہ ہنس دی۔

"باجی! خدا کے لئے!"

"لے لو نا اگر ہمت ہے! تم کتاب کیوں نہیں لائے؟"

ناصر پرچے لینے کیلئے آگے بڑھا۔ شاکرہ نے پرچوں کو پیچھے ہٹا لیا۔ ناصر پرچوں پر جھپٹا۔ شاکرہ نے انہیں اپنی آغوش میں دبا لیا۔ "میں نہیں دوں گی۔ میں نہیں دوں گی! تو تو جانوں!" شاکرہ نے ہنستے ہوئے ناصر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھبرایا ہوا ناصر جلد پرچے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ فرحت

بھائی اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔ شاکرہ کھلکھلا کر ہنسی اور ناصر کے ہاتھ کو اُس نے پرچوں سمیت اپنے قریب تر چھپا لیا۔ پرچے کشاکش میں نیچے گر پڑے مگر ناصر کا ہاتھ ہنوز گرفت میں تھا۔ اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے وُہ خرگوش کے چھوٹے بچوں کو مَس کر رہا ہے

"شاکرہ! شاکرہ! یہاں آؤ!"

شاکرہ اپنی اماں جان کی آواز سُن کر سیدھے سائبان کی طرف بھگی۔ پھر اُسے اپنی ہیئت کا خیال آگیا۔ کوٹھری میں واپس آکر اُس نے اپنے کو درست کیا تب اماں جان کے پاس گئی

"کیوں گیا کہ رہی تھی شاکرہ؟ کنواری لڑکیاں بھی بھلا اس طرح ہنستی ہیں"!

"میں "راہِ نجات" پڑھ رہی تھی اماں جان خرگوش کے بچے میز پر چڑھنے کی کوشش میں گر گر پڑتے تھے۔ مجھے ہنسی آگئی"۔

"بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے۔ کنواری لڑکیوں کو شرم و حیا چاہئیے۔ اچھا ذرا کی ذرا خالہ بی کیلئے فرنی تو پکالو۔ کیوڑا اور پستے کی ہوائیاں دیدینا۔ دو انڈے بھی تل لینا۔ نعمت خانہ میں حلوا ہے، وُہ بھی لیتی آنا۔ جاؤ سلیقے سے ناشتہ کا سامان کرو —— جلد —— ہاں جاؤ!"

"جی اچھا اماں جان!" کہتی ہوئی شاکرہ باورچی خانہ کو نہایت ہی مؤدبانہ طور پر چلدی

"خالہ بی" کی آواز آئی ——

"بہن! ماشاءاللہ تمہاری لڑکیاں البتہ باحیا باتمیز ہیں"۔

اب؟

اکبرپور ریلوے اسٹیشن کے سامنے بہت سے یکّے لگے ہوئے تھے اور دو موٹر لاریاں کھڑی تھیں۔ ڈرائیور اور کارندے سامنے کے قصباتی چائے خانے میں بھنکتی ہوئی مکھیوں، سوکھے بسکٹوں اور پرانی کیتلیوں کے درمیان گندی ٹاٹ کی چٹائی پر بیٹھے ہوئے "چاہ" پی رہے تھے کڑے کاٹھ بسکٹوں کو توڑتے ہوئے ان کے جبڑے، دانت، لب اور آنکھیں سب مل کر آپس کی طرح طرح کی چپقلش سے چہروں کے متعدد خندہ آفریں نمونے بنا رہے تھے اور پھر یہ سخت جان بسکٹ ملگجی چائے کی پیالی میں غوطوں پر غوطے کھلائے جاتے تھے اور کچے اپلوں کی طرح پھول کر چائے کی سطح پر تیرنے لگتے تھے۔ موٹی توند اور میلی دھوتی والے حلوائی کی دوکان کے سامنے بھی کچوریاں اور آلو کی کالی کالی ترکاریاں کم اور پیتل کے لوٹوں میں پانی

زیادہ استعمال ہو رہا تھا مگر سب سے زیادہ بھیڑ خوانچہ والے کے گرد تھی۔ بوڑھے، جوان، یکہ بان اور قلی دھیلے پیسے کی گھگنیاں لیکر کھا رہے تھے۔ کوئی پتوں پر کا مصالحہ چاٹ رہا تھا۔ کوئی اپنی انگلیوں کو منہ میں ڈال کر چٹخارے لے رہا تھا اور کوئی اس کی بھی توفیق نہ پا کر حسرت سے دیکھ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ موٹے، مضمحل، کالے اور بھورے کتے اِدھر اُدھر دونے چاٹ رہے تھے۔ آپس میں چخ چخ اور دھول دھپا بھی ہو رہی تھی۔ موٹے کتے کمزوروں پر غرّاتے تھے اور کمزور موقع کی تلاش میں تاک لگاتے بیٹھے تھے۔ خوانچہ والا ایک لانبی چھڑی سے اپنے سر کے اوپر تھوڑے تھوڑے وقفے پر ہوا میں دائرے پر دائرہ بنا رہا تھا کیونکہ بھاری بھرکم چیلیں فضا میں دلیرانہ منڈلا رہی تھیں اور کالے چالاک کوّے اپنے گول دیدے پھاڑے اچکوں کی طرح گھات میں لگے ہوتے تھے۔

اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھانت بھانت قسم کے مسافر ٹکٹ کٹا کٹا کے جمع ہو رہے تھے۔ دور یارڈ میں مال گاڑی کے چند خالی ڈبے غریب الدیار مسافر کی طرح کھڑے ہوئے تھے اور انجن کو پانی پلانے والا اشتر گردن بنا اُن کا مذاق اڑا رہا تھا۔ ٹن! ٹن! ٹن! ٹن! ٹن! ٹن! دوسری گھنٹی بجی۔ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ قرمزی کپڑے کی وردیاں پہنے ہوئے قلی بے تحاشا دوڑ پڑے۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب کالا کوٹ پہنے اور سفید عینک ناک پر نیچی لگائے ہوئے اپنی اہمیت کے احساس سے لبریز کمرے سے باہر نکلے اور کسی لٹھ بردار دیہاتی کی بدحواس دوڑ کے سبب اُس سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"ابے حرامزادہ سالا! سوجھتا نہیں!" اسٹیشن ماسٹر صاحب گدرے ہوئے خطرے کے

خوف کی جھرجھری لیتے ہوتے بولے۔ قلیوں اور خلاصیوں نے صدائے بازگشت کی طرح مزید اعلان کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"ہوں! اندھا سالے کو تو دیکھو۔ پکڑو سالے کو۔ تیری آنکھ اندھے کے جنے تیری دم میں گھس گئی ہے۔ دیکھتا نہیں اسٹیشن ماسٹر صاحب کھڑے ہیں . . . ."

یکہ بان اور موٹر لاری کے کارندے بھاگتے ہوتے آئے اور اسٹیشن کے آہنی پھاٹک کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ عفریت کی طرح شور مچاتی برانچ لائن کی پسنجر لائن گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ ڈھک ڈھک پلیٹ فارم سے آکر لگ گئی اور ہر طرف ایک عجیب سا خلفشار مچ گیا۔ مسافر خلط ملط ہو کر چڑھنے اترنے لگے یکہ بانوں اور لاری کے کارندوں نے نعرے لگانے شروع کئے ——

دلدار نگر —— مخدوم پور —— چلئے! چلئے —— سدلیسو پور —— دلدار نگر —— چلئے! —— موٹر لاری! موٹر لاری! —— بابو یکّہ! حاجر ہے! یکہ! یکہ! ٹم ٹم! جہاں چلئے آرام کی سواری! ٹہٹا۔ بھرت پور —— مخدوم پور —— دلدار نگر! موٹر —— موٹر، یکّہ یکہ! ٹم ٹم! —— حجور ادھر آیئے —— ادھر ادھر حجور! —— مالک جنانہ سواری یکہ پر . . . . ."

پھاٹک پر لال پیلا ٹکٹ دکھا دکھا کر مسافر باہر جانے لگے اور ان کے حصول کے لئے کشاکش شروع ہو گئی۔ اس لائن میں پہلے لاری نہیں چلتی تھی۔ لہذا عام طور سے یکہ بانوں کو لاری سے مخاصمت تھی۔ مگر لاری کی کامیابی اور مسافروں کی قلت کے سبب یکہ والوں کی آپس میں چشمک ہی نہیں پرخاش تھی۔ پہلے تو دونوں لاری والوں میں بھی لڑائی تھی لیکن

انہوں نے ایکا کر کے وقت بانٹ لیا تھا۔

مسافر زیادہ تر خود ہی لاری کی طرف رُخ کر رہے تھے مگر یکّہ بانوں اور لاری والوں کی چیخ پکار جاری تھی بلکہ گھبراہٹ میں اور تیز ہو گئی تھی۔

ایک منچلے یکہ بان نے اپنی ناکامیابی کے دُکھ کو چھپانے کے لئے ایک طنزیہ صدا لگائی ——— "ٹائر پھٹ۔ موٹر بسٹ! یکّہ سو پکّا، موٹر پر کھاؤ دھکا!" اکثر یکّے پڑتی کھیت کی طرح خالی پڑے ہوئے تھے۔ ایک دو پر اُن سمتوں میں جانے والے مسافر چڑھے تھے۔ جن اطراف میں لاری نہیں جاتی تھی۔ ایک یکہ والے سے لاری کے کارندے لڑائی کر رہے تھے۔ "مسافر کو چھین لینا خراب بات ہے۔ ہم کہہ دے ہیں ہانک پکار کے۔ ہم کامپٹیشن کرنے لگیں گے تو تم سب بم بول دو گے۔ ہم سے بیر اچھا نہیں"۔ یکہ والے نے جواب دیا ———

"ہم کامپیٹشن نہیں کرتے ہیں۔ تم لوگ ہمرے سب کا روجی مار کے بھی جبردستی کرتے ہو۔"

"تمہیں مسافر چھین لینے والا کون ہے؟"

"سوجھتا نہیں کہ مسافر اپنے سے یکّہ پر آیا"۔

"ہمرے آنکھ میں دھول ڈالنا چاہتا ہے بے"۔ لاری کے کارندے اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے خوب چڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ کیونکہ لاری کا مالک آج لائن کے ملاحظہ میں آیا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ بات بڑھ گئی اور اب ہاتھا پائی تک نوبت پہنچنے والی تھی۔ گالیوں کا سرمایہ بھی

فریقین نے ختم کر دیا تھا کہ خود مسافر نے بات دبا دینی چاہی

"ارے بھائی لڑو مت! ہم جنانہ سواری کے کھبال سے یکّہ پر اپنے سے آکے بیٹھے ہیں۔"

وقت پر لاری کے مالک نے بھی گرج کر کہا "چھوڑ دو! ان کمینوں کو، یہ رانڑجات اب تو لات سے بھی نہیں مانتے۔ ببیوں کی مار سالوں کو دو تو سب شیخی نکل جائے گی۔ اگر یہی حال رہا تو ہم مفت میں سب مسافر کو لے جائیں گے۔ دیکھیں یہ کھلیپھا کے دن تک سسک سسک کے چلتے ہیں؟ بال بچے بھوک مریں گے تب سب کس بل نکل جائیگا۔ ۔ ۔"

غصے کی رو میں بابو کرپال سنگھ، مالک مخدوم پور اکسپریس، انتقامی جذبات کی انتہائی منزل تک پہنچے جا رہے تھے کہ اُن کے ضمیر نے ہلکی سی ملامت کی۔ جب اُس کے جوش میں کمی آئی تو دماغ نے سوچنا شروع کیا۔ کرپال سنگھ فطرتاً سخت دل آدمی نہ تھے۔

"ان کے بال بچے بال بچے آخر میرے بال بچوں کی طرح کے تو ہیں۔ بال بچوں پر مار ٹھیک نہیں۔ اگر اتنے مسافر اُتریں کہ میرا بھی پیٹ بھرے اور ان کا بھی دلدّر دور ہو تو بہت اچھا ہو۔ مگر آج کل کاربار بھی تو دھیما ہے۔ بڑا بُرا سمئے آگیا۔ عزّت بچانی مُشکل ہے۔"

کاروبار کا خیال آتے ہی کرپال سنگھ کے سامنے عملی ضروریات کے مطالبات آ گئے۔

"اگر لاری کی لائن نہ چلے تو پھر میرے بال بچے کیا کریں گے۔ جمیندار ی تو مکدمہ اور سادی بیاہ کے بخر ہو تی۔ سپھید پوسی نبا ہنی بھی جرور ہے اور سلے رعیت کسان سبھا کے اندولن سے ملگجاری بھی تو نہیں دیتے۔"

کرپال سنگھ کو پھر غصہ آگیا۔ زندگی کے بہیمانہ مقابلے میں حیثیت کی فکر سارے جذبات پر حاوی رہتی ہے۔ انہوں نے اپنے کارندوں کی ہمت بڑھانے اور یکہ بانوں کو ڈرانے کے لئے مصلحتاً گرج کر کہا:۔

"یہ کمینے لوگ اگر پھر بدمعاشی کریں تو ان کو ٹھیک کر دو۔ ہم دیا کرکے چھوڑ دیتے ہیں تو یہ نیچ جات والے اور سر پر چڑھ کر ناچتے ہیں"۔

لاری کے پاس ہی جمنا یکہ بان اپنے دانت پیس رہا تھا۔ وہ زیرلب بڑبڑانے لگا۔

"ہونہہ! دیا کرکے چھوڑ دیتے ہیں۔ . . . ! بہت بڑے دیالو۔ . . . گریب کا روجی مار کے دیا دھرم کا نام جپتے ہیں سرم بھی تو نہیں لگت۔ سب یکہ والے تو مر گئے۔ اب کرایہ گھٹا کے اپنا نکسان کر و گے، ہونہہ! اُلٹا احسان ہمرے سب پر۔ دیا کرکے چھوڑ دیتے ہیں۔ . . . ! سالے سب یکہ والے بھی تو بے شرم ہیں۔ لوٹ لے لاری کو۔ . . . توڑ پھوڑ دے سیسہ۔ . . . پھاڑ دے ٹائر۔ . . ."

جمنا کا تخیل جذبۂ انتقام کی گرمی سے بے باک تر ہوتا جا رہا تھا۔ خود جذب کی شدت نے اُسے چونکا سا دیا۔ . . وہ محسوس کرنے لگا کہ یہ سب خیال خام ہے۔ لاحاصل۔ . . بے کار۔ . . غریب کا حصہ غریب کے ٹہر۔ مایوسی نے جمنا کو پھر گھیر لیا۔ نراس کے ساتھ شدید بھوک کا احساس بھی اس کے جسم کے ذرے ذرے میں نشتر چبھو رہا تھا۔ اُس کے دل کی گہرائیوں میں بغاوت اور مقابلے کا ایک تازہ طوفان اُٹھنے لگا۔ وہ تنہا مقابلہ کرے گا۔ بزدل یکہ بانوں کا گلا گھونٹنے کے بعد وہ لاریوں کو دیا سلائی کے ڈبے کی طرح چور کر رکھ دے گا۔ . . جمنا

بپھرے ہوئے جذبات کی روانی میں بہا جا رہا تھا کہ لاری پوں پوں پوں پوں کرتی ہوئی اکبر پور کے بازار سے گذر گئی۔ موٹر پر چند لڑکوں نے شور مچایا۔ . . . مُنہ بنا بنا کر پوں پوں کی نقلیں اتاریں اور پھر سب کے سب گرد کی چادر میں لپٹی ہوئی موٹر کے پیچھے دوڑ گئے۔ بازاری کتوں نے بھی دور تک لاری کا دھاوا کیا۔ جُمنا یہ منظر دیکھ کر کچھ مسرور سا ہوا۔ کتوں کی جھاؤں جھاؤں اور بھوں بھوں خود اُس کے دل کی آواز سے مشابہ تھی۔ اُسے گوؔلا، کالو اور بنڈؔا پر بہت پیار آ رہا تھا۔ وُہ انسانوں سے زیادہ اُس کے ہمدرد معلوم ہو رہے تھے جُمنا نے للکارا . . . . .

"واہ بٹیا بنڈؔا! لینا ہے کالو . . . . گولا گوؔلا! لیو لیو لیو! لگ، لگ لیو! لگ لگ لگ، لیو لیو لیو! چالیس سال کا یکہ بان بچوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ للکار کے متوازن اتار چڑھاؤ سے اُس کے جذبات کے شعلے تیز تر بھڑک اُٹھے۔ اب طفلانہ کیفیت کی جگہ وحشیانہ تعاقب کا بھوت اُس پر سوار ہو گیا۔ جُمنا نے سچ مچ اپنے نحیف گھوڑے کو جلد جلد تین چار چابک رسید کئے اور خود بھی یکہ کی نشست پر بے چین ہو کر وہ اپنے اعضاء کو حسبت کرنے کی حالت میں لے آیا۔ گھوڑا اچانک کی مار سے بھڑک کر یکہ کو سرپٹ لے بھاگا۔ جُمنا اپنے خیال میں اپنے دشمن کا قاتلانہ تعاقب کر رہا تھا۔ اکبر پور کے بازار میں ہلڑ سی مچ گئی۔ کئی دہقانی گھبراہٹ میں دوڑ پڑے۔ کسی نے چھلانگ لگائی، کوئی چیخ اٹھا۔ سڑک سودا بیچنے والے اور بیچنے والیوں میں بھاگڑ کی وجہ سے کچھ تو جیبیں بر جیبیں قسم کا اُلجھاؤ پیدا ہوا اور کچھ دلچسپ نوعیت کی خلط ملط رونما ہوئی۔ وہ کانوں اور بیسیر ہٹوں

سے لوگ نمائش بینی کے لئے باہر نکل آئے۔ قصباتی شاہدانِ بازاری کو بہ یک وقت نمائش اور دل بہلاؤ کا موقع مل گیا۔ وُہ بھی مٹکتی ہوئی زینوں اور دہلیزوں پر آ گئیں۔ بازار میں چلتی ہوئی پرانی سنگر مشینوں کا سمع خراش نغمہ بھی کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔ پُرانی سفید عینکیں لگائے ہوئے نوکیلی داڑھیوں والے بوڑھے خلیفے اور تیل سے چمکتے ہوئے انگریزی بال رکھنے والے گلابی اور فیروزی بنیائین پہنے ہوئے نوجوان درزی بھی بر سرِ راہ نکل آئے بگ ٹٹ یکہ کے تماشے کے علاوہ مبالغہ کے ساتھ نخرے کرنے والی رنڈیوں کے نین بھی جھمک رہے تھے۔

جُمنا دُور تک اسی بے تحاشا انداز میں یکہ دوڑائے چلا گیا۔ کئی کتے تھک کر پیچھے رہ گئے مگر بنڈا جُمنا کا ساتھ دیتا رہا۔ راستے میں لڑکوں نے خوب خوب شور مچایا۔ موٹر لاری دُھر کھیل کرتی ہوئی بہت دور جا چکی تھی۔ جب مقصود سامنے نہ رہے تو پھر کوشش سرد پڑ جاتی ہے۔ جُمنا کا بحران دور ہوا اور اُس کا مریل گھوڑا بھی قابو میں آگیا۔ اُسے خفت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُسے غصہ آنے لگا۔ اضطراب و ہیجان کے بعد وُہ تھکاوٹ بھی محسوس کر رہا تھا۔ خاص کر اس حال میں کہ اُس نے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا اور آج بھی اُسے اسٹیشن پر ایک بھی مسافر نہیں ملا تھا۔ خفت، خفگی، ناکامی اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت میں وُہ آہستہ آہستہ یکہ ہنکاتا لوٹا آ رہا تھا کہ بہت سے لڑکوں اور چند بے فکروں نے جمع ہو کر جُمنا کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ پھبتیاں کسی گئیں۔ بولیاں بولی گئیں، حملہ بازباں ہوئیں، تھپڑیاں اور نعرے مزید برآں۔ بھرے

بازار کا جاگا ہوا ہیجان اب جمن کے خلاف بڑھ رہا تھا۔ جمن نے لڑکوں کو گالیاں دیں، کوسا۔ ایک دو کو چابک بھی رسید کیا۔

"امی کتنے کے پلّے مریں بھی نا۔"

کوستا، گالیاں دیتا، چابک لہراتا جمنا بڑھا جا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ سب فسادیوں کو یکہ تلے کچل کر رکھ دے مگر وہ ایسا کب کر سکتا تھا۔ اکبر پور میں اُسے زندگی بسر کرنی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لڑکے چلّا رہے تھے۔ . . . . . واہ جمن پوں پوں! واہ جمن پوں پوں پوں!" جمنا اپنے آپے سے باہر ہونے لگا۔ اُس نے دو چار کو چابک کے دستے سے پیٹا مگر یہ بلا تو قدموں لگی تھی۔ اب چورہے کے قریب تو بڑے بوڑھوں نے بھی بولی ٹھولی سے جمن کی تواضع کی۔ جمن کی ہیئت کذائی اور اُس کے گرد غول بیابانی کو دیکھ کر کسبیوں نے بھی پھبتیاں سیٹیں شروع کیں۔ جمنا کو اپنے اوپر رحم آنے لگا۔ وہ دنیا سے بیزار ہو رہا تھا۔ اُسکی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ اُس کے دل نے محسوس کیا۔ کہ ساری دنیا اُس کو شکار بنائے ہوئے ہے۔ اُسے جھنجھوڑے ڈالتی ہے اور اسے فنا کر دینے کے درپے ہے۔ اپنے اندر وہ تابِ مقابلہ کو گھل گھل کر مٹتا پا رہا تھا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی فوری خفت کو چھپانے کے لئے یکہ کو ٹھہرا کر ایک بنئے کی دوکان میں گھس گیا۔

"چودھری! ایک پیسے کی بڑی تو دو!"

جمنا نے بلا سوچے سمجھے بڑی خریدنی چاہی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اُس کی گرہ میں

کوڑی بھی نہیں ہے۔ مگر وُہ مانگ تو چکا ہی تھا۔ جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"جمن اب ادھار ایک پائی بھی نہیں نخرے ہیاں پہلے بہت کرجہ باکی ہے . . . ."

پھر بھی جمنا نے بنئے کی دوکان میں دیر لگائی تا کہ بے فکروں، لفنگوں اور شیطان کے گرد، بازاری لڑکوں کے ہنگامے ختم ہو چکیں

جب جُمنا دوکان سے باہر آیا تو اُس کا دماغ آج کی فکر، کل کے فکر، کل کے سوچ اور ایسے ہی نامراد آنے والے دنوں کے رنج میں غرق تھا

سامنے سے ایک بوروں سے لدی ہوئی بیل گاڑی گذر رہی تھی۔ اس کے عقب میں پرچوں کی دوکان کی دیوار پر "برٹینیا بسکٹ" کا اشتہاری ٹین لگا ہوا تھا جو وقتی طور پر بوروں سے چھپ کر پھر نمودار ہوا اور اُس کے پہلو میں "لپٹن ٹی" کا بڑا سا بورڈ بھی آویزاں تھا۔ بازار کے لوگ اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ رنڈیاں بھی اپنی اپنی کوٹھریوں میں واپس جا رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک گٹھے بھرپور جوان گوٹھے کو ساری کی لپیٹن کے اندر جمنا نے کوٹھری کے اندھیرے میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اُسے جانے کیوں اپنی جوان بیٹی یاد آگئی۔ جس کی شادی محض اس کی غربت کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی اور وُہ لرز کر رہ گیا۔ بیس سال کی چٹان سی ہندوستانی لڑکی . . . . جمنا کو تکلیف وہ حیرت کا احساس ہوا کہ کمبخت کیا کھا کے ایسی جوان ہو گئی۔ بھوک مرتے تو دن کٹے۔ اس پر یہ بدن ہاتھ نکالا ہے۔ اُس وقت اُس کی یہ عجیب سی تمنا تھی کہ اس کی سب بیٹیاں مر جائیں کمبخت ہیں بھی تو پانچ عدد . . . . . اور وُہ دو بیٹے۔ سب سے بڑی تو وہ بڈھی

گھوڑی اُس کی بیوی کہ دئے جاتی ہے بچے پر بچے۔ اسی کا گلہ کیوں نہ گھونٹ دیا جائے . . . . اس خیال کے آتے ہی اچانک اُسے اپنے سارے بال بچوں پر رحم آنے لگا اور اپنی شریکِ حیات پر بھی۔ اُس کی یہ خواہش ہوئی کہ وُہ خود ہی کچھ کھا کے سو رہے . . . . .

جمنا کو اپنا گذرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ بازار میں ٹھٹھیرے دھات کے برتن پیٹ رہے تھے اور ایک سکھ جوتشی سڑک پر شکار پھانسنے کے لئے منڈلا رہا تھا۔ ایک دفعہ جب جمنا ابھی اپنے کھیت سے بے دخل نہیں ہوا تھا۔ کسی جوتشی نے اُسے یہ خوش آئند بات بتائی تھی کہ اس کو بہت سی دولت ملنے والی ہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کھیت سے بے دخل ہو جانے کے بعد گھر کا برتن بھانڈا گروی رکھ کر اُسے یکہ خریدنا پڑا اور اُس کی بیوی کی ہنسلی بیچکر اُس نے گھوڑا مول لیا۔

جمنا نے ایک دلدوز آہِ سرد کھینچی۔ وہ ایک باعزت کسان تھا۔ اپنی محنت سے اپنے کھیتوں کو جوتھی کی دلہن بنائے رہتا تھا۔ اُسے محنت سے رغبت تھی۔ بلکہ محنت ہی اُس کی زندگی تھی جب اُس کے کھیت پک کر سونے کی طرح پیلے ہو جاتے تھے تو وہ ایک غنی دل کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا کرتا تھا۔ پھر اُس کی بدقسمتی کا دور۔ فصل کی خرابی مالگذاری کا بقایا . . . . ساہوکار سے قرض . . . سود در سود اور پھر سارے کھیت نیلام۔ خدا نے تو دو تین سال کے بعد رحم کیا تھا۔ بارشیں خوب ہوئیں اور فصل بھی اچھی لگی۔ مگر انسانوں کا گھن۔ خدا کی آزمائش جا اُس کی لعنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ خدا کا

قانون نہ سمجھ میں آئے مگر انسانوں کا نظام تو سمجھ میں آتا ہے۔ ایک بہیمانہ مقابلہ۔۔۔ اگر کوئی کمزور ذرا اگر جائے تو پھر ساری دنیا اُسے پیستی ہوئی روندتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔

دُکھ اور مصیبت کے وقت آدمی فلسفی بن جاتا ہے۔ جمنا اپنے رنگ میں اسی قسم کے خیالات میں غرق تھا۔ لیکن انسان صرف خیالات ہی میں اُلجھا نہیں رہ سکتا۔

وہ اپنے یکہ پر آکر بیٹھ گیا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔ اُس سے گھر جایا نہ جاتا تھا۔ اُس کی بیا، اُس کے بال بچے بھی چوبیس گھنٹوں سے فاقہ کئے ہوئے تھے۔ یکہ بانی سے اس کی گذر بسر ہوتی چلی جا رہی تھی لیکن جب سے اس سڑک پر لاری چلنے لگی تھی جمنا اور دوسرے یکہ بانوں کا دیوالہ ہی نکل گیا تھا۔ دو مہینے سے قرض پر بسر اوقات تھی اور اب تو بنئے بھی ہوا کا رُخ دیکھ کر ادھار دینے کے نام سے کانوں پر دھرتے تھے۔

ناامیدی کی تند ہوا کی زد پر امید کا دیا جلانا زندگی کے اَنگنت بھیدوں میں سے ایک راز ہے۔ جمنا یکّہ سے اتر پڑا اور تاس کے چراغ کی لَو کو دانستہ تیز کرتا ہوا بدھن ساؤ کی دوکان پر پہنچا۔ بدھن ساؤ قصبہ کا سب سے بڑا آڑھتیا تھا اور اپنے پُن دھرم کے کاموں کے لئے بھی خاصی شہرت رکھتا تھا۔ پُن پُن ندی کے کنارے سروستی جی کا مندر اسی کا بنوایا ہوا تھا۔ یوں ہر روز بھی سنت سادھو اس کی ڈیوڑھی سے دچھنا لے جایا کرتے تھے۔ اُسکی آڑھت میں ہزاروں من غلّہ اکثر رہتا تھا۔ آڑھت کے سامنے اس کی دوکان بھی تھی۔ جمنا سیدھا بدھن ساؤ کی دوکان میں گیا۔ ساؤ گدی پر براجمان تھا۔ اُس کے شکن اندر شکن توند سے پسینہ نکل رہا تھا۔ میلی سی دھوتی جانگھ تک چڑھی ہوئی تھی۔ فربہ چہرے پر قشقہ لگا ہوا تھا اور لوہے کی تجوری

پاس ہی رکھی ہوئی تھی کئی ملازمین دوکان کا کام سنبھالے ہوئے تھے اور منیب کھاروال کی سُرخ جلد والی پیلی بہی پر حساب کتاب لکھ رہا تھا جمنا پر فضا رکا رعب طاری ہوگیا مگر ضرورت ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ اُسی نے بدھن ساؤ سے عرض کی۔۔۔ "جو رمائے باپ اسر کار پریم احال جاہر ہے جورہ جان بچالیں تو جنم بھر کی گُلامی نوکر نا ہیئے ہے۔۔۔"

بدھن ساؤ منیب سے لیکر حساب دیکھنے لگا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد جُمنا نے پھر اپنا دکھڑا سنایا تو ساؤ نے نہایت ہی ایماندارانہ کاروباری انداز میں جواب دیا۔

"جمن اکاروبار میں ادھار سدھار بگیر آگمے کی اُمید پہ نہیں دیا جاتا۔۔۔" اور پھر وہ حساب کی جھجارت میں اٹل طور پر لگ گیا

جمنا بے حس ساؤ دوکان سے باہر نکلا۔ وڈوٹے ساؤ ھولو ہے کے چُونٹے جھنجھنا تے اور آتشیر باد دیتے دوکان میں داخل ہو رہے تھے تھوڑی دیر کے لئے تو جُمنا کا دماغ بالکل ایک خلا جیسا تھا۔ پھر اُس پر جذبات کی ایک رو طاری ہوئی۔ وہ اپنے مریل گھوڑے کو جب اگر پیار کرنے لگا غیر معمولی پیار اور جب جذبات کا سیلاب رُکا تو جمنا کے دماغ میں صرف ایک مہیب سوال گونج رہا تھا —— اب؟ ——

گندے انڈے

"یار آج داناپور رجمنٹ اور ٹاؤن اسپورٹنگ کا میچ ہے۔" کلّو نے عیدو نانبائی سے کہا۔

"سچ کہو؟ یار کلّو کام تو سالا سو دن کا ہے۔ ہم بھی میچ ضرور دیکھیں گے۔ بکرو داکو دکان پہ بٹھا دیں گے۔" عیدو بولا۔

دس بجے دن کو عیدو نانبائی کی دکان کے سامنے باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ سن رسیدہ لوگ، جوان، چھوکرے۔ نانبائی کی دکان محلے بھر میں بیک وقت کلب، ریڈنگ روم اور کونسل ہال کی حیثیت رکھتی تھی۔

کلّو اس حلقے میں سب سے زیادہ باخبر شخص تھا۔ یہاں اس کی حیثیت صدر کی سی تھی۔ محلے میں اس کا کافی اثر تھا۔ کلو اور عبید ولد کپتن کے دوست تھے۔ اس ادھیڑ عمر میں بھی ان کی نبھی جا رہی تھی۔ عبید تین پشت سے نانبائی تھا اور اس نے اپنے بیٹے قمرو کو بھی اسی کام پر لگا یا تھا۔ مگر وہ ذرا کھلنڈرا تھا۔ لونڈوں کے ساتھ لٹو، پتنگ بازی، تاش میں وقت گذار رہتا تھا۔ کلو کا باپ حقہ مرمت کیا کرتا تھا۔ اس کی تو اچھی گذر گئی۔ رئیسوں کے یہاں پہنچ تھی۔ وہ حقہ چڑھانے میں بھی ماہر تھا۔ اس کام میں اسے فن کاری کا درجہ حاصل تھا۔ تمباکو کی قسمیں، چلم کے اقسام، سرپوش کے سائز، حقوں کے انواع، حقہ نوشوں کی مزاج کی نوعیت، موسم کا اثر حقہ اور اس کے متعلقات پر، ان سب باتوں کے متعلق "میر صاحب" کی واقفیت حیرت انگیز تھی۔ وہ محلہ کیا شہر بھر میں "حقہ والے میر صاحب" کے نام سے خاص و عام میں مشہور تھا۔ جب تک اس کی کمر خم نہیں ہوئی تھی وہ اپنے محلے کے اکھاڑے میں استادی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ لکڑی، لاٹھی، گتکا، لنگیٹھی بنوٹ، تلوار، رومالی ہر فن میں وہ طاق تھا۔ جن کے آثار پر بھی اس کا ہاتھ دیکھنے کے قابل تھا۔ اپنے بیٹے کلو کو بھی اس نے اپنے فنون سکھانے چاہے لیکن وہ لڑکپن سے شریر اور بھگوڑا تھا۔ اسے دنگل، بھیڑے کی لڑائی، بٹیر بازی، فٹ بال میچ اور نوٹنکی کا شوق تھا۔ محرم کے اکھاڑوں میں نام پیدا کرنے کیلئے اس نے باپ سے لکڑی، گتکا، تلوار کے ہاتھ تو سیکھ لئے لیکن حقے کے فن سے اسے نفرت تھی اور ہمیشہ رہی۔ "میر صاحب" پر بڑھاپا طاری ہوتا گیا اور پھر سگریٹوں کی وہ دھواں دھار ہوئی کہ حقے کی گرم بازاری سرد پڑ گئی اور میر صاحب کا پیشہ ماند پڑ گیا۔ کلو اپنے دوست عبید نانبائی کی روٹیاں بیچ کر اپنے کنبے کا پیٹ پالنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر اس کا خیال اونچا تھا اور اس کی ناک اس کے خیال سے بھی زیادہ اونچی تھی۔ وہ صرف افسروں کی کوٹھیوں پر جا کر پاؤ روٹیاں اور کیک فروخت کیا کرتا تھا۔ پھر شام کو بنگلوں کی خبریں خوب نمک مرچ لگا کر دکان پر سناتا

"یار عبیدوا ہم تو لاکھ برس گلیوں میں پھر کر دربدر روٹیاں نہ بیچیں۔ اللہ کی قسم کوٹھیوں پر جو عجب ہے سو کہیں نہیں! باورچی، بیرا، مالی، خانساماں سب بھلے سے بولے ہیں اور میم صاحب بھی ہنس ہنس کر بات کرتے ہیں۔۔۔"

"ہاں بھائی کلو میم صاحب لوگ بھی۔۔۔" جمعہ باورچی حیرت اور حسرت سے آنکھیں مٹمٹانے لگتا

"ارے رجمو اب کا!" کلو سرپرستانہ انداز میں کہتا۔ "ولایت کے صاحب لوگ تو یہاں سے ہٹ چلے گئے تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اب تو بنگالی بابو کی چلتی بنتی ہے۔ ایک آدھ اپنے دیس کے لوگ بھی ہیں کچھ مسلمان رئیس کے لڑکے بھی پڑھ لکھ کر افسر ہوئے ہیں مگر افسر لوگ سب اچھے ہوئے ہیں سرکاری ٹھاٹھ باٹھ ہے۔" سرکاری پر کافی زور دیتے ہوئے۔

شبراتی قلعی گر معاملہ فہمی کے ساتھ اپنا چندلا سر ہلاتا اور عبیدہ گڑگڑی کے دو تین کش لگاتا لیکر نمروا کو پکارنے لگتا۔ ہر دس بارہ منٹ کے بعد وہ اپنے بیٹے کے شجرۂ نسب کے متعلق نئی نئی تحقیقات کا اعلان کرتے ہوئے اُسے آواز دیا کرتا تھا۔ مگر اُس کا سعادت آثار فرزند ہمیشہ مفقود الخبر ہی رہتا۔

"ہم تو اپنے شہر کے ٹاؤن اسپوٹنگ کی طرف ہیں یار عبیدو۔ رجمنٹ والے سالے بوٹ پہنے کھیلے ہیں۔ سالے کرنٹے!" کلو نے کرنٹے اس طرح کہا کہ وہ دنیا بھر کے کرنٹوں کا گلا گھونٹ کر ہی تو جیسے رکھ دیگا۔

"اوستاد! کہو تو حربہ ہتھیار ساتھ رکھ لیں۔ پولیس سالا کیا کرے گا!" رمضانی گاڑیبان نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔

"نہیں رے رمضنیاں! ہم نہتے سالے گوروں پر بھاری ہیں۔ کلو نے اپنے آبائی فن کے زعم میں کہا
"نہیں بھائی لڑائی بھڑائی ٹھیک نہیں۔ گورا چمڑا ہی حاکم ہے۔"
خیراتی درزی نے اپنی نوکیلی داڑھی ہلاتے ہوئے رو پہلے بیضوی چشمے کے اوپر سے مشورہ دیکر اپنی اہمیت ثابت کرنی چاہی۔
"ہاں کھلیپھ! ٹھیک بات ہے۔" عیدو نے تاکید کی۔
"ارے ان کرنٹوں کی مرمت تو کلکتہ میں ہووے ہے کلکتہ میں محمڈن اسپوٹنگ کے میچ میں جُما کھاں اور سا تو ان سالے حرامجادوں کو ایسا لینا دے ہیں، اتنا بھر مار مارے ہیں کہ نکری پھور پلیس ویری وَل دھمم کی راہ سے نکل جا ہے۔" مجمع پر اُسکے "کلکتہ رٹرنڈ" ہونے کا رعب پڑا اور خود اُس کے جذبۂ انتقام کو تسکین ہوئی۔ بات یہ تھی کہ کوٹھیوں پر وہ صاحب لوگوں سے اکثر جوتوں کی ٹھوکریں اور ہنٹر کی مار کھا چکا تھا جلی ہوئی پاوَر روٹی یا باسی کیک سپلائی کرنے پر اس کی ایسی تواضع اکثر ہوتی تھی۔ مگر محلے میں اپنا وقار قائم رکھنے کیلئے وہ صاحب اور میم صاحب لوگوں کی بہت بڑائی کیا کرتا تھا۔ کلو کی اپنی طاقت اور باپ کی استادی کے سبب محلے والوں میں اُس کی قدر تھی اور وہ اس قدر میں ہمیشہ اضافہ کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا اُس میں ترقی کرنے کی زبردست خواہش پائی جاتی تھی۔ شاید نوجوانی کی لاپروائی کا نفسی کفارہ تھا۔
"بھائی ہم لوگ کبھی محمڈن کا میچ نہیں دیکھا۔" عیدو نے بڑی حسرت سے کہا۔
"ارے یار عیدو! ہم بھی کیا آدمی ہیں۔ کلپے چٹرجی بابو کی کوٹھی پہ ریڈیو کا کھبر تھا کہ محمڈن اسپوٹنگ اور موہن بگان کا میچ ہیاں ہوگا۔ ہم بھُل گئے۔ تم سب کو کہے کو۔"
"آئین محمڈن کا!" ہر طرف سے حیرت زدہ آوازیں آئیں۔ "ہاں ہاں! محمڈن اسپوٹنگ کا میچ

موہن بگان سے،" کلّو نے نہایت تیقن سے کہا۔

"ہاتھ لاؤ اوستاد! سچ؟ محمڈن کا میچ؟" رمضنیاں گاڑیبان تو آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا

"ارے یار کلّو کب ہے میچ۔ جلدی سے بتاؤ نا!" عیدو نے بےقراری سے دریافت کیا۔ اور اسے خیال آیا کہ اُسے ذرا بھی قمروا کو دوکان پر بٹھانا پڑیگا — "ارے الّو کا پٹھا کھب بھبس کا جناحرامجادہ سوہر کا بچہ! دن بھر لٹو کھیلے گا رے!۔ ارے کمروا! کہاں گیا رے! دو گھڑی تو دوکان پہ بیٹھا کر کس ساہت کا پیدا ہے رے..."

عیدو کی نسلی تشریحات اور جنسی انکشافات کا سلسلہ ذرا لمبا ہوتا جا رہا ہے اور اُدھر یاروں کے پیٹ میں محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے میچ کی تاریخ جاننے کے لئے چوہا کود رہا تھا۔

"ارے جانے دو عیدو بھائی۔ لڑکا ہے لڑکا... ہاں استاد کب ہے میچ؟ یار کسمت کھلی ہے۔" رمضنیاں نے دریافت کیا۔

"آج لہیری شلڈ کا فائنل ہے اور کل پس کل محمڈن کا چریٹی میچ ہے۔ سنا ہے لڑائی کیلئے چندہ جمع ہوگا۔ سرکاری سکٹری کے افسر کبیر صاحب کہہ رہے تھے۔

کیا کہبو بھائی؟ کل؟ ائیس کل؟ تو سرکاری میچ ہوا نہ؟" عیدو بولا۔

"تو اور کا! کبیر صاحب بولے میاں کلّو! تم کو تو میچ کا بہت شوکھ ہے۔ محمڈن کا میچ ہوگا اور آٹھ آنہ فی کس ٹکٹ! ہم کہا کہ سرکار کی جندگی چاہیے میچ تو جرور دیکھیں گے۔ بھائی! یہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بہت اچھے ہیں۔ ہر دم کہیں لڑکے کو پڑھاؤ لڑکے کو پڑھاؤ۔ انہیں کے کہے سننے سے تو اسگروا کو ہم پڑھے کو بٹھا دیا۔ کون جانے شیراتی میاں کسمت کے بھید ہم سب کا دن اسگروا کے بہانے ہی پلٹ جائے میر صاحب سے گدی پہ کے مُتن نواب صاحب بات چیت کیا کرتے تھے کیسی کدربات تھی۔ اور آج یہ دن ہے۔ پاک پروردگار

کی قدرت۔ اور اُس کی شان دیکھو۔ نواب صاحب کی ڈیوڑھی بھی آباد نہیں رہی اور محل کے کھنڈر بھی آج کے ہیں بن گئے ہیں۔ اللہ کی قدرت ہم سا کس گنتی میں ہیں اور اُس کو قسمت پلٹتے بھی دیر نہیں۔"

خیراتی درزی اور شبراتی قلعی گر نے خدا رسول کی بات سن کر متاثر ہونے کی کوشش کی۔ "اللہ اور پیغمبر کی باتیں جب ہوں تو ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔" "ہاں بھائی۔ پاک پروردگار سب کا مالک جو چاہے کرے!" شبراتی نے پھیپھڑوں کی گہرائی سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ اُس کی چندیا کچھ زیادہ چمک اُٹھی "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارا!" خیراتی درزی نے اپنی نوکیلی داڑھی کو سمیٹ کر ہاتھ سے داہنے بائیں دیہاتی انداز میں جنبش دی۔ رضیاں کچھ اکتا سا گیا اور اعصابی تناؤ کو دور کرنے کے لیے اُس نے گلی کی طرف نگاہ کی۔ جہاں بھاری سینے والی ایک عورت ترکاری کا ٹوکرا اٹھائے تیزی سے جا رہی تھی۔

رضیاں نے ایک انگڑائی لی اور بولا۔

"تو اُستاد! اٹھہ آنے کھیلیں میچ کی!" اُس کے ذہن میں چوک کے محاذ پر بیٹھنے والی کسبیاں تھیں۔ وہ میچ اور کسبیوں میں موازنہ کر رہا تھا۔ اور عبید، قمرو اور اصغر واکے مستقبل کا مقابلہ کر کے اپنے دوست کلو سے جل رہا تھا۔

"اٹھہ آنے کی کیا ہستی ہے۔ میچ کے کھلاڑی ملک میں نامی۔ سات سمندر پار تک انکے نام کا ڈنکا بجے ہے۔ جو ہو سو ہو میچ تو ضرور دیکھا جائے اور بات جب ہے کی محلے سے ساری پارٹی چلے" حامی تو سب نے بھر لی مگر اٹھنی جیسے حلق میں اٹکی جاتی ہو۔ عبید تو کیک کے ساتھ اُسے کوشش کر کے نگل گیا شبراتی اور خیراتی اُس کی خلش بری طرح محسوس کرتے رہے۔ رضیاں نے اُسے وقتی طور پر ذہن سے اُڑا دیا اور اُس کے تعاقب میں خود بھی خیالات کی فضا میں پرواز کرنے لگا اور کلّو صاحبوں کے بنگلوں کے

درمیان گھومنے لگا۔ اٹھنی ذرا سخت تھی۔

کلّو کو میچ دیکھنے کا بے حد شوق تھا مگر آٹھ آنے خرچ کرکے میچ کو دیکھنا اُسے بھی اکھر رہا تھا۔ اُسکے لئے اتنی رقم بہت تھی جب سے بڑے بڑے ہوٹل کھل گئے تھے۔ "ریجس"، "ڈاوس"، "گرانڈ ہوٹل" وغیرہ پرانے طرز کے نانبائیوں کی دکانیں نیچے گر رہی تھیں۔ کلّو کو یہ بات کبھی سمجھ نہ آئی کہ جب صاحب لوگ اور اُنکے نقال بابو لوگ اونچی دکانوں اور کمپنیوں پر کیوں رنجھے رہتے ہیں۔ پکانے والے تو ہر جگہ نانبائی ہی ہوتے ہیں۔ کلّو کی طبیعت میں اُبھرنے کی خواہش بہت تھی۔ اُس نے بھی ٹوکری اور خوانچہ ترک کر دیا اور "گرانڈ ہوٹل" کی نقل میں ایک بڑا سا بکس بنوا لیا تھا جس پر کریم پینٹر سے اُس نے سیٹی بیکری بہت ہی نمایاں پھولدار خط میں لکھوایا تھا۔ پہلے پہل جب وہ سیٹی بیکری لکھا ہوا بکس اٹھا کر کوٹھیوں کے طواف کیلئے چلا تھا تو وہ اپنا سر کتنا اونچا محسوس کر رہا تھا اور اسکی گردن کی رگوں میں فخر و انبساط کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اس روز اُس نے بہت سے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ پھلنے پھرنے کے خواب۔ اُس نے یہ شیخ چلی کے سے خواب نہایت سنجیدگی سے دیکھے تھے۔ شیخ چلی ہمیشہ سنجیدہ ہی ہوتا ہے۔ اُس کی سنجیدگی ہی دنیا والوں کیلئے مزاح اور اُسکے لئے درد و سوز پیدا کرتی ہے۔ اُس نے ایک کیک سے ابتدا کی اور کیک کے اوپر کیک رکھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کا اپنا ایک بہت بڑا گرانڈ ہوٹل بن گیا۔ اُسی روز اُس نے یہ بھی طے کر لیا کہ صغروا کو پڑھا لکھا کر وہ افسر بنوائے گا۔ اُس نے محلے کے مدرسے میں اپنے بیٹے کو بٹھا دیا اور اُسکے مکتب کے وقت مولوی صاحب اور محلہ والوں کا منہ بھی میٹھا کیا۔ مگر ہوا یہ کہ کلّو سے مدرسے کے مولوی صاحب کا ماہانہ مشاہرہ بھی ٹھیک سے نہ چل سکا۔ پہلے تو اُس نے جوش میں بڑی باضابطگی دکھائی لیکن جب

بڑے ہوٹلوں کے مقابلے میں اُس کا بیوپار گرنے لگا تو مہینے خالی جانے لگے۔ مولوی صاحب تقاضا تو نہ کرتے تھے لیکن جس مہینے میں مشاہرہ نہ ملتا تھا وہ اصغروا کو بری طرح پیٹتے۔ حالانکہ وہ تیز اور ذہین لڑکا تھا۔ اظہارِ خیال کا یہ طریقہ خاصا پُر اثر ہوتا ہے۔ مگر پٹنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب خالی مہینوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو مولوی صاحب کلّو سے اکثر کہنے لگے میاں کلو اصغروا نہایت کند ذہن ہے۔ بالکل کندۂ ناتراش۔ اسکے ساتھ سر کھپانے سے کیا فائدہ۔ مدرسے سے ہٹوا لو اس پاجی کو" کلو اسکا مطلب ٹھیک وہی سمجھتا جو مولوی صاحب سمجھانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی اپنی حالت تو یہ تھی کہ سیٹی بیکری کا بکس محض نام ہی کا رہ گیا تھا۔ یوں محلے والوں پر تھوڑا رعب ضرور پڑتا رہتا تھا۔ وہ تو اب بنگلوں پر انڈے اور چوزے سپلائی کیا کرتا تھا اور وہ بھی چپ چاپ سیٹی بیکری کی منیجری سے گر کر مرغی والا ہرگز کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس نے کلکتے جا کر بھی قسمت آزمائی کر دیکھی۔ کلکتہ لاکھ بڑا سہی لیکن ساری دُنیا تو اُس میں سما نہیں سکتی۔

"پارٹی چلے گی تو پھر میرا جانا بھی جرری ہے۔" کلّو نے سوچا "ہم محمڈن کے میچ کا بات ہی کاہے کو نکالا!" مگر اب تو وقار کا سوال تھا کچھ ہو جائے۔ ناک اونچی رہے۔ دن بھر کلو نے اپنے ذرائع سے انڈے اور چوزے جمع کرائے۔ انہیں لے کر کوٹھیوں اور بنگلوں پر گیا اور جتنا ہو سکا کل پرسوں کے وعدے پر ادھار بیچ آیا۔ پھر بھی آدھے کے قریب انڈے اور چوزے بچ ہی رہے۔ اِس تجارت میں اُسکا اجارہ تھوڑا ہی تھا بہر حال اُسے باورچیوں اور بیروں کی خوشامدیں کرنی ہی پڑتی تھیں مگر سب سے زیادہ ٹیڑھی کھیر ہندوستانی میم صاحبائیں ہوتی ہیں۔ وہ ان کی کھچ کھچ سے عاجز تھا۔ ایک تو دام ساٹھ مول مولائی کرنے میں وہ چمر چٹ ہوتیں دوسرے خریداری کم کرتیں اور سب پر طرّہ یہ کہ انڈے اگر گندے ہونگے تو واپس کئے جائینگے، دام کٹے گا۔

خریداری بند کی جائے گی وغیرہ کا الٹی میٹم۔ اب مصیبت یہ کہ زیادہ ہندوستانی افسر ہی مقرر ہوتے جا رہے تھے اور اُن کی بیویاں بیگم صاحب یا بہورانی تو ہوتیں نہیں بلکہ "نقلی میم صاحب لوگ" بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہر بات میں اُن کا دخل ضروری۔ دھوبی، حجام، مہتر سے وہ منہ لگیں، روٹی والے، پھل والے، مرغی والے، انڈے والے کا دین و دنیا خراب۔ اُن سے نوکر، چپراسی، باورچی بلکہ خود اُن کے صاحبوں کی روح ہر وقت لرزتی رہتی ہے۔ محلے کی رونق، گھر کی ڈکٹیٹر۔ ولایتی میم صاحبائیں ٹھوکریں تو لگاتی تھیں مگر اُن سے پیسے بھی خوب ملتے تھے۔ اور جو پیسے کافی ملیں تو بڑے بڑے افسر بھی صاحب بہادروں کی ٹھوکر کھانے کو تیار رہتے ہیں لیکن اب تو پیسوں پر مہر تھی۔ اور کھچ کھچ مفت کی۔

شام کو کلّو کی پارٹی نے دانا پور رجمنٹ، اور ٹاؤن کلب کا میچ دیکھا۔ مقابلے کا رہا اور دوسرا کھیل پرسوں پر ملتوی کر دیا گیا کیونکہ دوسرے دن محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے درمیان چیریٹی میچ تھا۔ پارٹی نے گرینوں کو خوب گالیاں دیں، ہندوستانی ٹیم کا دل خوب چیخ چیخ کر بڑھایا۔ آج کے میچ نے کل کے لئے سب کو اور بیقرار کر دیا۔ رات گئے تک عبدو کی دوکان پر میچ کے متعلق رائے زنی ہوتی رہی اور کل کے بارے میں قیاس آرائیاں۔ شاید سوتے میں بھی سبھوں نے فٹ بال میچ ہی کے خواب دیکھے ہونگے۔

صبح ہوتے ہی کلّو پھیری میں نکل گیا۔ بِکری ہو نہ ہو وہ سیٹی بیکری کا بکس اٹھا کر ایک گشت ضرور کر آتا تھا۔ اس کام سے اس کی شخصیت کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ اُس سے علیحدہ ہونا سخت اذیت رساں ہوتا۔ اب عقل کی رہبری میں نہیں بلکہ ایک اندرونی مطالبے کے ماتحت وہ صبح کا گشت

کیا کرتا تھا۔ آج اُس نے انڈے اور چوزے کے بقائے کا تقاضا بھی سویرے سے شروع کیا۔ ویسے وہ عموماً تقاضے میں مصلحتاً نرم تھا مگر آج وہ ذرا مجبور تھا۔ کل اُس نے خیراتی درزی سے روپے قرض لیکر انڈے اور چوزے مول لیئے تھے۔ وہ ایک ہی روز کا تھا۔ میچ کے بہانے خلیفہ آج ضرور تقاضا کرتا۔ کلّو یا تو اپنے یار عیدو سے قرض لیا کرتا تھا یا خیراتی سے۔ کسی تیسرے کے سامنے اُس نے کبھی ہاتھ نہیں پسارے۔ محلے میں آخر اُس کی ایک عزت تھی۔ روزمرّہ کے خرچ کے سلسلے میں وہ عیدو کا پہلے ہی سے کافی مقروض تھا۔ میچ کے لیئے اُس سے آٹھ آنے مانگنا قطعی ناممکن تھا۔ غرض خیراتی کا قرض ادا کرنے اور محمڈن کا میچ دیکھنے کے لئے آج کسی طرح اُسے خریداروں سے اپنے دام وصولنے تھے۔ بیوی نے آتے وقت گھر کے خرچ کے لئے پیسوں کا مطالبہ الگ کیا تھا۔ خیر وہ تو روز کا معاملہ ہے اُسے ٹالا بھی جا سکتا تھا۔ مجبوری کا نام صبر۔ وہ غریب تو اب عادتاً صبر و شکر کی عادی ہو گئی تھی۔

پہلے تو کلّو نے بکری کا سودا بیچنا چاہا۔ مگر جس دکان میں ہفتے ہفتے چیزیں یں پڑی بھلا دیاں کا باسی تو اسی سودا کیا خاک کوٹھیوں اور بنگلوں پر بکے کبھی کبھار۔ چپراسی، مالی، بیرے بسکٹ نان خطائی لے لیا کرتے تھے۔ اب جہاں جہاں چوزوں اور انڈوں کے دام باقی تھے کلّو نے تقاضا بھی شروع کیا۔ مگر جواب میں اُسے باورچیوں اور ملازموں کی ڈانٹیں سننی پڑیں۔

"کیا بلا کرتے ہو جی۔ کل سودا بیچا اور آج سر پہ سوار۔"

"کا بک بک ہے۔ اب کبھی تم سے سودا نہیں لیا جاگا" "جاؤ جاؤ کل پیسوں لے جاؤ گے" یہ سب تو انکار کی نرم قسمیں تھیں۔ اس سے بھی زیادہ گرم باتیں اور تلخ جھڑکیاں کلّو کے خیر مقدم کیلئے ارزاں کی گئیں۔ دوپہر ڈھل گئی مگر اُس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ بھلا اتنا جلد بھی کہیں تقاضا کیا جاتا ہے جن

بنگلوں کے باشیوں کو مہینے مہینے آنے والے بلوں کی عادت ہو وہ کل سودا اور آج دام سے بگڑ نہ جائیں تو اور کیا۔ یہی کلو عموماً ہفتے ہفتے پر حساب صاف کیا کرتا تھا۔ آج اُس نے الگ اپنی ضرورت دکھائی، احتیاج کا رونا رویا۔ مگر کسی کی خاطر اصول کیوں بدلے جائیں۔

جس کوارٹر سے کلو دانستہ طور پر گریز کر رہا تھا۔ آخر کار اُسے وہاں بھی جانا پڑا۔

"سیٹی بیکری! انڈا والا سرکار!" کلو نے صدا لگائی۔

"ہاں ہاں رحمت اس کو روکو! دنیا کتنی بے ایمان ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بدمعاش سمجھتے ہیں کہ مفت کا مال ہے بے ایمانی شیطانی سے خوب لوٹو۔ رحمت! دیکھو پٹاری میں انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ کل یہ ایک درجن انڈے دے گیا تھا۔ رات کو تین انڈے گندے نکلے سب واپس کر دو!" میم صاحب نے خفگی کے ساتھ نوکر کو ہدایات دیں۔

نوکر سات انڈے لیئے باہر نکلا۔ اور ضمیمے کے طور پر اُس نے بھی کلو کو بُری بھلی سنائی۔

"حجور! تین انڈا ہم دے جائیگے۔ ایک درجن پہلے کا دام مل جانا سرکار!"

"پہلے آٹھ انڈے بھی گندے نکلے تھے۔ کل نو میں کھلانا بھول ہی گئی تھی تم لوگ بلا ایمان ہو! ڈاکو ہو! نو آنے درجن انڈے! آگ کا مول اور اس پر یہ اندھیرا جب تو تو آدھے انڈے گندے لے جاؤ اپنے انڈے واپس!" میم صاحب اب خود دروازے پر آگئی تھیں۔

"سرکار تین انڈا ہم دے جائیگے۔ ایک درجن پہلے کا دام دیدیا جانا اور اُس کو بھی رکھ لیجئے۔ باورچی کا بدماشی ہو گا۔ حجور گندا انڈا رکھوا دیا کیجئے۔" کلو نے عرض کی۔ رحمت اندر جا چکا تھا۔

"آ ہٹن ایک درجن کہاں کا؟ چار پہلے کے اور دو کل کے اچھے نکلے تھے۔ تمہارا آدھے

درجن کی قیمت نکلی۔ لے جانا کیسی روز تم لوگ تو فقیر کی طرح لٹک جاتے ہو ہم لوگ کبھیر بھاگے جاتے ہیں ؟"

"سرکار آج بہت کام تھا۔ آٹھ آنہ بھی دے دیجئے۔ ایک آنہ پہلے کے حساب کا باقی رہے گا۔"

"دیکھو تو! ساڑھے چار آنے کو نو آنے بنانا ہے۔ مجھے چڑھاتا ہے بے؟ کیسے جھوٹے یہ کمینے ہوتے ہیں بیچتے وقت تو سو طرح سے وعدے کرتے ہیں اور دام لیتے وقت کیسی ڈھٹائی پر اتر آتے ہیں۔"

"حجور! گندا انڈا بلے دیکھے ہم مجرا نہیں دیں گے۔"

"تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟ جاؤ نہیں ملیں گے پیسے!"

"سرکار ہم انڈا کے پیٹ میں گھس کر دیکھے جا ہیں۔ اگر ایسا سودا بیچا کریں تو دیوالہ سدھ ہو جائے سب کوٹھے پر بیچے ہیں ایسا کہیں نہیں ہووے ہے۔" کلو نے تنگ آکر کہا اور میم صاحب بس آپے سے باہر ہو گئیں۔

"رحمت! رحمت! نکالو اس کو یہاں سے۔ بدتمیز، جھوٹا! بدمعاش! پاجی! گستاخ! جھوٹ بولتے شرم بھی نہیں آتی۔ عہد کر کر کے مکرتے ہیں یہ کمینے۔ خدا کا بھی خوف نہیں!"

خدا کا نام درمیان میں آتے ہی کلو کے رونگٹے ذرا دیر کیلئے کھڑے ہوئے لیکن ضرورت کی مار سخت ہوتی ہے۔ خدا کو کسی طرح بہلا لیا جاتا ہے۔ کلو نے معاہدہ تو ضرور کیا تھا کہ گندے انڈوں کے دام نہ لیگا مگر اس نے اپنے ضمیر کو یوں تسکین دی۔ غرض کے بندے پیٹ کے مارے جو معاہدہ کر لیں۔ اور پھر کیا ضرور کہ میم صاحب

پسج ہی بول رہی ہوں ضمیر کے نشتر سے بچ کے اب ذرا وہ دلیر ہو کے بولا "نہیں! ہم تو ایک درجن کا دام لینگے"
یہ آخری دروازہ تھا میم صاحب کلو کی ہٹ دھرمی سنکر بیحد برافروختہ اور چراغ پا ہو گئیں۔ کل کے گندے
انڈے سرے پر ذرا نوڑے ہوئے باورچی خانے میں رکھے تھے۔ انہیں وہ اٹھا لائیں اور کلو کے سامنے
رکھے ہوئے انڈوں پر زور سے ٹپک دیا۔ کئی انڈے ٹوٹ کر بھرکس ہو گئے۔ زردیاں اور سفیدیاں لت پت
ہو کر پھیل گئیں۔ کلو کے دل میں ہلکا سا درد پیدا ہو کر غصّے کی لہروں میں ڈوب گیا۔

کلو کا سینہ اپنے قہر کی آگ سے پھنک رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اُن سارے بنگلے اور کوٹھیوں
کے رہنے والوں کے سر پر دنیا بھر کے گندے انڈے لا کر ٹپک دے۔

اگست کا آفتاب اُسکے منہ پر پڑ رہا تھا۔ سہ پہر ہو چلی تھی۔ راستے بھر کلو کے دماغ میں عنکبوتی
خیالات جالے بنتے رہے۔ غصے سے اُسکی کنپٹیوں میں گرم گرم خون دوڑ رہا تھا۔ اُس نے ایسا محسوس کیا کہ
فضا میں ہر طرف اچھے انڈوں اور گندے انڈوں کے درمیان میچ ہو رہا ہے۔ اُس نے ایک غیر واضح سی ہمدردی
گندے انڈوں کیلئے محسوس کی۔ گندے انڈے میچ جیت گئے۔ مگر آخر میں جھنجھلا کر اچھے انڈے اُن پر ٹوٹ
پڑے۔ بڑی زبردست ٹکر ہوئی۔ ساری دنیا چھلکوں، زردیوں اور سفیدیوں میں خلط ملط ہو کر غرق
ہو گئی۔ ہر سو ایک درد انقلاب آ گیا۔

"میاں کلو! بس آج اصغر دا کو لیجاؤ۔ بُرے لڑکے اچھوں کو بھی خراب کر دیتے ہیں۔ یہ لونڈا
شیطان کا بچہ ہے۔ بلکہ اُس کا بھی دادا۔ اب ہم نہیں رکھنے اِسے مدرسے میں۔ دیکھو آج اردو کی
دوسری نہیں لایا اور اُلٹا بدتمیزی کرتا تھا۔"

مدرسے کے مولوی صاحب نے کلو کو خوش آمدید کہی۔ کلو نے اصغر دا کا کان پکڑا اور اُسے پیٹتا ہوا

گھر سے چلا۔ کلو کے اعصاب زیادہ دیر تک تناؤ نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ اُس نے اپنا بھوت اپنے بیٹے پر اتارا۔ اصغروا بے طرح پٹا۔ کلو کے دل میں درد پیدا ہونے لگا۔ یہ درد کی موج اُس کی شخصیت کی گہرائی سے اُٹھی۔ اصغروا اب افسر نہیں بنے گا۔ بے چارا! اصغروا پر اُسے ترس آنے لگا جیسے اُسے ہیم صاحب کے ٹوٹے ہوئے انڈوں پر ترس آیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اپنے پر اپنے ارمان پر بھی ترس کھا رہا ہے۔ اپنی زندگی بھر کی نامرادی اُسے بہت بھاری معلوم ہوئی۔ اس وزن سے بچنے کے لیئے اُس نے پھر اصغروا کو پیٹنا شروع کیا۔ کلو کو زوروں سے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اُسے سرسری طور پر یاد آیا کہ گھر میں کچھ نہیں اور بیوی پھر پیسے مانگے گی۔ اُس کا غصہ اور بھڑک اُٹھا۔ اصغروا پر مار زیادہ تیزی سے پڑنے لگی اور بیوی کے مطالبے کو اُس کے قلب کی گہرائیوں میں خاموش بٹھا دینے کے لئے کلو نے اصغروا کو گالیاں بھی دینی شروع کیں۔ اب وہ گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ بیوی نے بڑھ کر بچے کو چھڑانے کی کوشش کی۔ کلو کے دل میں پھر ایک ہوک سی اُٹھی۔ اُس کا غصہ دھیما پڑنے لگا نقلی ایندھن زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔ اب رسوائی اور نامرادی اس کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ پاڈی!

میچ! مدرسہ! اصغروا!

کلو نے محسوس کیا کہ اصغروا، وہ خود، اُس کی بیوی اور محلّے کے لوگ سب کے سب محض انڈے ہیں۔ گندے انڈے!

کتبہ:۔ اقبال عباسی [illegible]